نسٹیئن

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا ادبی مجلّہ

نسٹیئن

2013

جلد: 3

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا ادبی مجلّہ

سرپرست

انجینئر محمد اصغر
ریکٹر

مجلسِ مشاورت

انجینئر محمد شاہد
پرو ریکٹر

ڈاکٹر آصف رضا
پرو ریکٹر

محمود بشیر باجوہ
ڈائریکٹر سٹوڈنٹ افیئرز

مدیر:
احسان الحق
ڈپٹی ڈائریکٹر سٹوڈنٹ افیئرز

مدیر طلباء:
محمد عثمان اختر، ادیبہ رحمٰن

ترتیب وتزئین: ندیم شہزاد

طابع: **نسٹ پریس**

ناشر: **سٹوڈنٹ افیئرز ڈائریکٹوریٹ**

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی، اسلام آباد

ترتیب

اداریہ		6
اخلاقیات		
حمدِ باری تعالیٰ	ارفع خالد	8
نعتِ رسولِ مقبولؐ	شاہد ماکلی	9
قیامِ پاکستان کی پیش گوئی	علامہ اقبالؒ	10
قرآن کا مصنف کون؟	حسنین جاوید	11
عشقِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	فاروق سلطان	14
الشُّکرُ اللہِ عزّوجل	مرزا محمد بلال اصغر عطاری	16
حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزاح	حافظ آصف خلیل	19
مشعلِ راہ	نوید عباس	20
نماز کی اہمیّت	حافظ محمد سہیل اکرم	21
میٹھے بول	نوید عباس	22
مسیحا	سلمان فلک	23
چودہ خصلتیں	ہما جاوید	24
اقبالؒ کا تصوّرِ مومن	سیّدہ فوزیہ	25
میں نے رُلتے ہوئے کیچڑ میں گُہر دیکھے ہیں	محمد ارسلان احمد	26
پاکستانیات		
نظریۂ پاکستان – زندہ ہے زندہ رہے گا	مختار مسعود	29
پاکستان کا تھنک ٹینک	پروفیسر فتح محمد ملک	30
قائدِ اعظمؒ کیا چاہتے تھے؟	ڈاکٹر صفدر محمود	32
اٹل تقاضا	ممتاز اقبال ملک	35
پاکستان کا مطلب کیا	سرو سہارنپوری	47
ہماری بنیاد	ممتاز اقبال ملک	48
پیارا پاکستان	لالۂ صحرائی	54
مضامین		
اقبالؒ اور عقل و عشق	حسنین نواز	56
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو	فرحت زمان	59
اعضائے حِسّیات	مرزا انس بن سیف	61
ادھار	حسن مسعود	63
زندگی	اویس عزیز	64
''صاحبِ حال'' لوگ	سیّدہ فوزیہ	65
تبدیلی کا آغاز – اپنی ذات سے	محمد احمد	66
''دوئی''	ادیبہ رحمٰن	68

غزلیات

	محمد عثمان اختر، عزیر اللہ، محمد صہیب اکرم، کنول شاہین، ادیبہ رحمٰن، اسد طارق، وسیم خان، خان حسان محمد، ذیشان مبارک، محمد عثمان اختر، عتیق الرحمٰن، اسد طارق، ادیبہ رحمٰن، کنول شاہین	71

افسانے

قربانی	محمد عثمان اختر	86
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے	فرح بانو	93
زندگی کچھ اس طرح	رضا اللہ آصف	95
میں یہ کس کے نام لکھوں – (بہار کے نام)	عزیر اللہ	97
مجھے تم سے محبت ہے	ابوبکر داؤد	99
ایک آؤٹ پاس کی آپ بیتی	جدعا افتخار	101
خبردار آگے ای ایم ای کالج ہے	محمد طٰہٰ منظور	103
ایک کمبل کی آپ بیتی	گمنام	106
تکمیل	احتشام قاضی	107
شناخت	سعد احمد	108
نادرہ	محمد عثمان اختر	110
غلط راستہ	اسد طارق	113

منظومات

ربُّ العلیٰ	تابندہ اشرف	123
شہرِ اسلام آباد	محمد عثمان اختر	124
ماں	محمد عمیر	125
سوچتا ہوں میں	اسد طارق	126
میرے مولا	فیصل اصغر	127
تم	سعد علی	128
عورت	وجیہہ حسن	129
میرا شہر	آسمہ ہاشم	130
کبھی تو آغاز باب ہوگا	محسن ممتاز مرزا	131
محبت	عثمان رسول	132
عکس	اسد طارق	133
اَے شہیدِ وفا اَے شہید وطن	محمد عمیر	135
روشن کرنیں	اویس عزیز	138

تبصرے

نسٹ کا منفرد اعزاز	عبدالقادر حسن، الطاف حسن قریشی، ظہیر احمد، سلیم منصور خالد، ڈاکٹر محمد اجمل نیازی، پروفیسر سیّد مشکور حسین یاد	140

ہمارے ادارے

کالج آف الیکٹریکل اینڈ میکینکل انجینئرنگ	College of E&ME
ملٹری کالج آف انجینئرنگ	MCE
ملٹری کالج آف سگنلز	MCS
پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج	PNEC
آرمی میڈیکل کالج	AM College
کالج آف ایروناٹیکل انجینئرنگ	CAE
سکول آف سِول اینڈ انوائرمنٹل انجینئرنگ	SCEE
سکول آف الیکٹریکل انجینئرنگ اینڈ کمپیوٹر سائنس	SEECS
سکول آف کیمیکل اینڈ مٹیریلز انجینئرنگ	SCME
سکول آف میکینکل اینڈ مینوفیکچرنگ انجینئرنگ	SMME
نَسٹ بزنس سکول	NBS
عطاء الرحمان سکول آف اپلائیڈ بائیوسائنسز	ASAB
ریسرچ سینٹر فار ماڈلنگ اینڈ سیمولیشن	RCMS
سکول آف نیچرل سائنسز	SNS
نسٹ انسٹیٹیوٹ آف پیس اینڈ کانفلکٹ سٹڈیز	NIPCONS
سکول آف آرٹ، ڈیزائن اینڈ آرکی ٹیکچر	SADA
نسٹ انسٹیٹیوٹ آف لیڈرشپ اِن ایجوکیشن	NILE
سینٹر فار انرجی سسٹم	CES
سینٹر فار انٹرنیشنل پیس اینڈ سٹیبلٹی	CIPS
سکول آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینیٹیز	S^3H
نسٹ پبلشنگ	NP

نسٹیئن کا نیا سلسلہ

اکابرین اور قارئین کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ''دی نسٹیئن'' کے آئندہ شمارے میں قندِ مکرّر کے عنوان سے ایک نیا سلسلہ شامل ہوگا۔ ہر سال ایک کھیپ تحصیلِ علم کے بعد نسٹ سے رخصت ہوتی اور ہزاروں نئے طلبہ نسٹیئن برادری میں شامل ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کے ادبی مجلّہ ''دی نسٹیئن'' کے سابقہ شماروں میں شامل مستقل اہمیت کی فکر انگیز تحریریں اس حصے میں شامل ہوں گی، تاکہ نئے آنے والوں کے دل و دماغ بھی ان سے روشنی اور رہنمائی پائیں۔ آپ بھی ان تحریروں کی نشاندہی کیجیے۔

(ادارۂ نسٹیئن)

اداریہ

عمومی طور پر سائنس اور ادب کو ایک پلیٹ فارم پر دیکھنا ہمارے معمول سے باہر کی شے ہے اور ہمارے ہاں اگر ان دو کا نام ساتھ ساتھ لیا جائے تو عوام انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ یہ اُن عوام کا ذکر ہے جنھوں نے سائنس کو ادب سے الگ سمجھ رکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ سائنس تک ادب کی رسائی ناممکن ہے۔ یہاں مجھے اچانک عمر خیام کا خیال آیا ہے جس کی رباعیات اور ریاضی میں خدمات بیک وقت یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ کیا اُس انسان کا دماغ ہم سب سے مختلف تھا جس نے دو متضاد راہوں میں اسے خرچ کیا؟ بالکل نہیں! وہ بھی ہم جیسا انسان تھا جس نے ادب اور سائنس کو ایک نقطے پر لا کھڑا کیا۔ اُس کے لئے یہ دونوں اشیاء مختلف نہیں تھیں اور ہونی بھی نہیں چاہئیں۔

اردو زبان پڑھنے والے ایک عام شخص کے لیے تو ادب اور سائنس کا ربط اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ وہ سائنس کو تب ہی سمجھنے کے لائق ہے، جب اسے کسی بھی زبان (ہمارے معاشرے کے لئے اردو) پر عبور حاصل ہو۔ ڈاکٹر مورس بوکائی نے تو سائنس اور قرآن کو ''بہنیں'' قرار دیا ہے اور ہم ادب کو ہی لیے بیٹھے ہیں!

'نسٹیئن' نے سائنس اور ادب کو یکجا کر کے دونوں کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ کسی ماہرِ فن اور فن اور ادب کو اگر فن کے زمرے میں ہی ڈال دیا جائے تو 'نسٹیئن' کسی 'گنجِ گراں مایہ' سے کم نہیں۔ اس میں ملک و ملّت سے عقیدت کا اظہار نظر آتا ہے اور سائنس کے میدان میں ادب کی دوڑ کا احاطہ بھی با آسانی کیا جا سکتا ہے۔ جہاں مغربی رنگ کی تحریریں نظر آتی ہیں، وہیں مشرقی نقش و نگار سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کا سامان بھی موجود ہے۔ شعر و ادب کے حوالے سے بھی اس رسالے نے اپنا مقام فرومایہ نہیں ہونے دیا۔ انتخابِ اشعار اور منظومات کے سلسلے نے اس کو نئی جلا بخشی ہے۔

سائنس اور اردو ادب کا تعلق نسٹیئن نے اور بھی راسخ کر دیا ہے کہ اردو ادب سے شغف رکھنے والا ایک عام انسان سائنس کے مضامین سے فیض یاب ہو سکتا ہے، جان سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے سائنس کو کس مقام تک پروان چڑھایا اور آنے والا معاشرہ کن طلسماتی اجزاء سے مزّین ہو گا۔ یہاں اقبالؒ کا وہ شعر تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے تقریباً ایک صدی قبل آج ہی کے زمانے کی تصویر کی نوعیت بیان کر دی تھی:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہُوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس شعر کے ضمن میں عرض ہے کہ اگر آج کے زمانے کی توضیح صرف دو مصرعوں میں اس خوبصورتی اور اختصار سے ہو سکتی ہے، تو نثر کا ہر حرف اہلِ علم کے نزدیک موتی کی مانند ہے۔ سائنس اور ادب کا گہرا تعلق ہمیں ہر دور میں نمایاں نظر آتا ہے اور کوئی قوم ان دو کے رابطے کے بغیر چل نہیں سکتی۔

سائنس کی الگ جگہ ہے اور ادب کی الگ، مگر ان کا رابطہ اور ملاپ ہمیں ایک نئے جہان سے روشناس کراتا ہے اور 'نسٹیئن' اس جہان کا ایک پاسبان ہے!

مدیر

اخلاقیات

ارفع خالد

حمدِ باری تعالیٰ

تو ہے کونین کا مالک میرے اللہ کیا لِکھوں
میں حیراں ہوں کہ کن الفاظ میں حمد و ثنا لِکھوں

زمین و آسماں ' ہر شے پہ تیری حکمرانی ہے
تجھے قیّوم ' مولا ' کبریا ' ربّ العلٰی لِکھوں

مجھے روزِ قیامت تیری بخشش پہ بھروسا ہے
اِدھر اپنے گناہوں پر بھی شرمندہ ہوں کیا لِکھوں

تُو ناداروں کا داتا ' بے سہاروں کا سہارا ہے
مقدّس ذات کو ٹوٹے دلوں کا آسرا لِکھوں

تیرا احسان کیا کم ہے محمدؐ سا نبی بھیجا
میں تیرے بعد اپنے دل پہ نامِ مصطفٰےؐ لِکھوں

شاھد ماکلی

نعتِ رسولِ مقبولؐ

اندھیری رات میں نورِ حرا کے ہوتے ہوئے
بھٹک رہا ہوں ترےؐ نقشِ پا کے ہوتے ہوئے

کبھی نہ آپؐ کی سیرت سے کسبِ فیض کیا
میں راہ بھول گیا رہنما کے ہوتے ہوئے

نہ جانے کیسی رکاوٹ کا سامنا ہے مجھے
سفر ادھورے پڑے ہیں دعا کے ہوتے ہوئے

مرے وجود میں خوابوں کی راکھ اُڑتی ہے
گلاب سُوکھ گئے ہیں گھٹا کے ہوتے ہوئے

ہمارے سینوں میں بیمار دل دھڑکتے ہیں
حضور! آپؐ کے دستِ شفاء کے ہوتے ہوئے

مہیب سائے مسلّط ہیں سرحدِ جاں پر
ہم اُن سے خوف زدہ ہیں خدا کے ہوتے ہوئے

زبان اسمِ محمدؐ کا ورد کرتی ہے
سلگتی ریت پہ جوروجفا کے ہوتے ہوئے

علامہ اقبالؒ

قیامِ پاکستان کی پیش گوئی

14فروری1912ء– 14اگست1947ء

آسماں ہو گا سحر کے نُور سے آئینہ پوش
اور ظُلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اِس قدر ہو گی ترنّم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نَوا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گُل کی ہم نَفَس بادِ صَبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مِری پَیدا کرے گی سوزوساز
اِس چمن کی ہر کلی دَرد آشنا ہو جائے گی

دیکھ لو گے سَطوَتِ رفتارِ دَریا کا مآل
موجِ مُضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی

پھر دِلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سُجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

نالۂ صیّاد سے ہوں گے نوا ساماں طیّور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہُوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شَب گُریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

حسنین جاوید

قرآن کا مصنف کون؟

''یہ کتاب اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔''(القرآن)

اس آیت کے مطابق قرآنِ پاک اللہ کی کتاب ہے اور اللہ کا نازل کردہ کلام ہے۔

کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ حضرت محمدؐ نے خود لکھ ڈالا پر یہ دعویٰ غلط ثابت ہو چکا ہے' کچھ کہتے ہیں کہ یہ دنیاوی چیزوں کے حصول کے لئے بولا گیا جھوٹ ہے۔نعوذ باللہ! یہ سب کچھ غلط ثابت ہو چکا ہے۔۔۔

سائنسی لوگوں کا طریقہ

کسی بھی نئے نظریئے کو متعارف کرانے کا سائنسی طریقہ یہ ہے کہ سب کے سامنے اپنا نظریہ پیش کیا جائے اور پھر تمام لوگوں کو یہ حق دے دیا جائے کہ اسے جھوٹا ثابت کرو۔ اس ضمن میں اس نظریئے کو بانی خود Falsification Test کا نام دیتا ہے۔اور یہ کسی بھی نظریئے کو جھوٹا ثابت کرنے سے اس کی سچائی کو ثابت کرنا' اپنی بات منوانے کا ایک منفرد طریقہ ہے۔جو اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا۔

ماضی کے 'Falsification Tests'

ابولہب کی کہانی:۔

ابولہب آپؐ کا پکا مخالف تھا۔جب بھی آپؐ کسی شخص سے بات کرتے وہ اس کے پاس جا کر اس سے بالکل متضاد بات کرتا۔شاید اسی لئے سورۃ لہب کے مطابق ابولہب اور اس کی بیوی ہمیشہ دوزخ میں ہی رہیں گے۔

اس پہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن پاک یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ دونوں کبھی مسلمان نہیں ہوں گے۔یہ آیت ابولہب کی موت سے دس سال قبل نازل ہوئی تھی۔ابولہب نے اسلام قبول نہیں کیا جبکہ اس کے چند اقارب نے اسلام قبول کر لیا تھا۔اسے صرف زبان سے اسلام قبول کرنا تھا' بے شک مسلمان بن کر نہ رہتا' تب بھی قرآن غلط ثابت ہو جاتا۔۔۔

اسے صرف ایک اضافی جھوٹ بولنا تھا!

حال کے 'Falsification Tests'

1۔ غیر مسلم عربیوں کے لیے Falsification Tests

قرآن مجید سورۃ اسراء رکوع 17' آیت 88 میں مخاطب ہوتا ہے:۔

''کہہ دو اگر سب آدمی اور سب جن مِل کر بھی ایسا قرآن لانا چاہیں تو ایسا نہیں لا سکتے اگرچہ ان میں ہر ایک' ایک دوسرے کا مددگار کیوں نہ ہو۔۔۔۔۔۔''

قرآن کو مسلم اور غیر مسلم دونوں حلقوں میں عربی کے ایک منفرد اور بے مثال کلام کی حیثیت حاصل ہے۔قرآن کی زبان بے حد معنی خیز' قابلِ فہم

اور کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ یہ سچائی کے راستوں کی پرچار کرتی ہے۔ بے شک اس میں نظم کی شکل میں کلام ہے' جبکہ باقی اکثر شاعری جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ مزید اس Test کو آسان بناتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

''کیا یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اسے بنالیا ہے؟ تم فرماؤ! تو اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کو چھوڑ کر جو مل سکیں سب کو بلا لاؤ اگر تم سچے ہو۔''

(سورۃ یونس' آیت 38)

جب قرآن نازل ہوا' عربی زبان کا بول بالا تھا۔ کچھ قادرالکلام شعراء نے کوشش کی لیکن وہ بُری طرح ناکام ہوئے۔ ان کا کچھ کلام (قرآن جیسا لکھنے کے چکر میں) ابھی بھی کچھ کتابوں میں محفوظ ہے' جو کہ لطیفوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ 1400 سال قبل بھی تھا اور اب بھی ہے۔ آج بھی 14 ملین سے بھی زیادہ عیسائی ایسے ہیں جن کی مادری زبان عربی ہے لیکن ابھی تک کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ کوئی یہ امتحان پاس کرے' اور نہ ہی کبھی ہوگا۔ انشاءاللہ

2۔ کیا قرآن سائنس کا ٹیسٹ پاس کرسکتا ہے؟

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ آج کل تمام دنیا پر سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کی حکمرانی ہے۔

تو آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک (جو کہ سائنس سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے) سائنس کا امتحان پاس کرتا ہے یا نہیں۔ درج ذیل کچھ امثال ہیں۔

کائنات کا ارتقاء:۔

1973ء میں دو سائنسدانوں کو نوبل پرائز سے نوازا گیا' کیونکہ انہوں نے Big Bang تھیوری پیش کی تھی جس کے مطابق ایک بڑے دھماکے Big Bang کی وجہ سے Primary Nebula مختلف سیاروں' ستاروں اور کہکشاؤں میں تقسیم ہوگیا۔

قرآنِ پاک نے اس کے بارے میں تقریباً 1400 سال پہلے فرمایا:۔

''کیا منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین جڑے ہوئے تھے' پھر ہم نے انہیں جدا جدا کردیا۔'' (سورۃ الانبیاء' آیت 30)

چاند کی روشنی:۔

سائنسدان اب انکشاف کررہے ہیں کہ چاند کی روشنی اس کی اپنی نہیں بلکہ یہ سورج کی روشنی ہے جو چاند پر سے منعکس ہوتی ہے۔ 1400 سال قبل سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''بڑی برکت والا ہے وہ جس نے آسمان میں ستارے بنائے اور اس میں چراغ اور چمکتا ہوا قمر (چاند) بھی بنایا۔''

چاند کو عربی میں ''قَمَر اً'' اور روشنی کو ''مُنِیر اً'' کہتے ہیں۔ منیراً کا مطلب ہے لی ہوئی روشنی (Reflection)

سورج کی حرکت:۔

سائنس کے مطابق سورج ساکن ہے۔ لیکن جیسے جیسے مزید تحقیق ہوئی' اب سائنسدان کہتے ہیں کہ سورج متحرک ہے۔ قرآن فرماتا ہے:۔

''اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو بنایا۔ یہ سب (یعنی سورج اور ستارے) آسمان میں (اس طرح چلتے ہیں گویا) تیرے رہے ہیں۔'' (سورۃ الانبیاء' آیت 33)

Embryology کے دائرے میں:۔

انسان کی تخلیق کے متعلق قرآن کی سب سے اوّل نازل ہونے والی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''پڑھ! اپنے پروردگار کا نام لے کر' جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا (جو لیچ کی مانند جسم سے چمٹا ہوا تھا)'' (سورۃ علق)

کچھ لوگ یہ آیت اور قرآن میں انسان کی تخلیق سے متعلق جو کچھ بھی ہے' Embryology کے ایک مایہ ناز پروفیسر' Prof.Keith L Moore (KLM) کے پاس لے کر گئے' اور کچھ عربیوں نے سوال کیا کہ کیا یہ قرآن میں جو لکھا ہے سچ ہے؟

انہوں نے کہا کہ جو کچھ قرآن میں اللہ نے فرمایا وہ سب 100% سچ ہے اور پوری طرح جدید ایمبریولوجی سے ملتا ہے۔ پر میں اس بات کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا کہ یہ لیچ کی طرح جسم سے چمٹا ہوا ہوتا ہے کیونکہ مَیں خود اس کے بارے میں نہیں جانتا۔

کچھ عرصہ بعد پروفیسر کیتھ نے ایک لیچ کی تصویر لی اور اسے اپنی لیب میں Developing Embryo کی مختلف فٹقلشف سے بہت احتیاط سے ملایا۔ اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ جو کچھ قرآن میں لکھا ہے بالکل سچ ہے۔

پین ریسیپٹرز (Pain Receptors)

پروفیسر ٹیگیٹیٹ ٹیجا سن نے Pain Receptors پر بہت تحقیق کی۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ صرف دماغ ہی درد کے احساس کو محسوس کرتا ہے' پر اب پتہ چلا کہ پورے جسم پر یہ خاص Pain Receptors موجود ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں چودہ سو سال پہلے فرما دیا۔

''بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا انہیں ہم آگ میں ڈال دیں گے۔ جس وقت ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کو اور کھالوں میں بدل دیں گے تا کہ عذاب چکھتے رہیں' بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔''

بالواسطہ قرآن کہہ رہا ہے کہ جلد میں کچھ ہے جو درد کے احساس کو محسوس کراتا ہے یہ Pain Receptors کی طرف اشارہ ہے شروع میں

حکایتِ سعدی

ایک نیک آدمی نے خواب میں دیکھا کہ ایک بادشاہ جنت میں ہے اور درویش دوزخ میں پڑا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ لوگ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ دوزخ میں ہوگا اور درویش جنت میں لیکن یہاں تو معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ معلوم نہیں اس کا کیا سبب ہے۔ غیب سے آواز آئی یہ بادشاہ درویشوں سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس لیے بہشت میں ہے اور اس درویش کو بادشاہوں کے تقرب کا بڑا شوق تھا اس لیے جہنم میں ہے۔

تو پروفیسر ٹیگیٹیٹ ٹیجا سن کو یقین نہیں آیا کہ قرآن 1400 سال قبل ہی Pain Receptors کی بات کر چکا ہے اور اس طرح انہوں نے ریاض میں ایک میڈیکل کانفرنس کے دوران اسلام قبول کیا اور کہا

"لا اله الا الله محمد رسول الله"

تو ان تمام اور کئی اور مثالوں اور ثبوتوں کو مدِ نظر رکھ کر کوئی بھی عقلمند انسان بہت آسانی سے یہ جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس دنیا کا اکیلا خالق و مالک ہے اور قرآن پاک کا مصنف بھی!

فاروق سلطان

عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت محمدؐ تمام انبیاءؑ کے امام ''افضل البشر'' اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبوب ترین ہستی ہیں۔ آپؐ کے لیے ساری کائنات بنائی گئی ہے۔ یہ ربِّ دو جہاں کی آپؐ سے محبت ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ قرآنِ مجید فرقانِ حمید متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے محبت کا اظہار فرمایا ہے۔ آپؐ کے شہر کی قسم کھائی اور انسانیت کو بھی آپؐ سے محبت وادب اور ان کے اسوۂ حسنہ پر عمل کا حکم دیا ہے۔

قرآنِ پاک کی سورہ اعراف کی آیت نمبر 157 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے:۔

''پس جو لوگ اس (برگزیدہ رسولؐ) پر ایمان لائیں گے اور ان کی تعظیم وتکریم کریں گے اور ان کے دین کی مدد اور نصرت کریں گے اور اس نور (قرآن) کی پیروی کریں گے، وہی فلاح پائیں گے۔'' (سورہ اعراف، آیت 157)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ الصّلوٰۃ والسلام سے محبت اور آپ کی عزت وتکریم کو دین ودنیا کی کامیابی کا ذریعہ بتایا ہے۔ جو لوگ آپؐ پر ایمان لائیں گے، آپ کی عزت وتکریم کرتے ہوئے آپ کی سنّت پر عمل کریں گے، ایسے لوگ کامیاب وکامران ہوں گے۔

ایک اور مقام پر ارشادِ ربّانی ہے:۔

''اے ایمان والو! اپنی آوازیں اونچی نہ کرو نبی علیہ السلام کی آواز سے اور ان کے حضور بات چلّا کر نہ کہو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے چلاتے ہو کہ کہیں تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں، اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔'' (سورۃ الحجرات، آیت 2)

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے اعمال کی قبولیت کی ایک شرط بیان فرمادی، کہ اُس شخص کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہیں، جس کے دل میں ادب وتعظیم مصطفیٰ علیہ السلام ہے۔ کوئی لاکھ نیک عمل کرلے، لیکن اگر ادب وتعظیمِ محمدؐ نہیں، تو اس کا کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قابلِ قبول نہیں۔

محبت ادب وتعظیم سکھاتی ہے۔ جہاں ادب نہیں وہاں محبت نہیں۔ ادب و احترام اور محبت لازم وملزوم ہیں۔ محبتِ مصطفیٰ میں اُن کا ادب اور اُن کی سنت پر عمل بہت ضروری ہے۔

عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احادیث کی روشنی میں:۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں، رسول اللہؐ نے فرمایا ''مجھے اُس ذات کی قسم، جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی بھی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ میں اسے والدین، اولاد اور تمام مخلوق سے بڑھ کر عزیز نہ ہو جاؤں۔'' (صحیح بخاری)

ایک اور واقعہ میں ذکر ہے کہ ایک شخص غزوہ حدیبیہ کے میدان میں اہلِ مکہ کا نمائندہ بن کر آتا ہے کہ لشکرِ اسلام کے احوال کے بارے میں جان

سکے تو وہ اہلِ مکہ کو جواب دیتا ہے کہ لشکرِ اسلام سے جنگ نہ کرنا' میں نے بہت سے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں لیکن دنیا کے کسی بادشاہ کے درباری اپنے بادشاہ کی وہ تعظیم نہیں کرتے' جو اصحابِ محمدؐ اپنے آقا کی کرتے ہیں۔ جب محمد علیہ السلام وضو کرتے ہیں تو اصحاب وضو کا پانی نیچے نہیں گرنے دیتے اگر محمدؐ لعابِ دہن پھینکتے ہیں تو وہ اسے زمین پر نہیں گرنے دیتے بلکہ اُس کو اپنے چہروں پر ملتے ہیں۔ (صحیح بخاری)

خلفائے راشدین کی زندگی سے ایک جھلک:۔

سعد بن سہل سعدیؓ روایت کرتے ہیں جس کا مفہوم ہے کہ رسول اللہ بنی عمرو بن عوف کی طرف تشریف لے گئے تا کہ ان کے درمیان صلح کروائیں۔ نمازِ عصر کا وقت ہوا' تو حضرت ابوبکر صدیق ؓ نماز پڑھانے لگے۔ اسی دوران رسول اللہؐ تشریف لے آئے۔ صحابہؓ نماز میں تھے' انہوں نے تالیاں بجا کر حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو متوجہ کرنا چاہا۔ جب آپؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو فوراً پیچھے ہٹنے لگے' حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی جگہ ٹھہرنے اور نماز مکمل کرنے کو کہا' حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ رسول اللہؐ نے انہیں اس قابل جانا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ پیچھے ہٹے اور رسول اللہؐ نے نماز مکمل فرمائی۔ نماز سے فارغ ہونے پر آپؐ نے فرمایا ''ابوبکر جب میں نے تمہیں حکم دیا کہ اپنی جگہ ٹھہرے رہو تو تمہیں ثابت قدم رہنے سے کس نے روکا؟'' حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے عرض کی یا رسول اللہؐ! ''ابوقحافہ کے بیٹے میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ رسول اللہؐ کے آگے نماز پڑھائے۔'' (صحیح بخاری)

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورِ اکرمؐ نے حضرت عثمان غنی ؓ کو مذاکرات کے لیے کفّارِ مکہ کے پاس بھیجا۔ کفارِ مکہ نے اجازت دی کہ اگر صرف وہ طوافِ کعبہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ مگر اس وقت حضور اکرمؐ کو طوافِ کعبہ کی اجازت نہ تھی۔ حضرت عثمان غنی ؓ کعبے کے صحن میں کھڑے ہیں اور چھ سال کے بعد آئے ہیں مگر طوافِ کعبہ کئے بغیر واپس چلے گئے کہ جب تک حضور اکرمؐ طواف نہیں کرتے تب تک میں بھی نہیں کروں گا۔ (بیہقی)

حضرت عمر فاروق ؓ سے روایت ہے' اُنہوں نے فرمایا ''اے اللہ مجھے شہادت نصیب فرما اور رسول اکرمؐ کے شہرِ مقدس میں مجھے موت عطا فرما۔'' (صحیح بخاری)

حضرت علیؓ مولا شیرِ خدا کرم اللہ وجہہ الکریم کے عشقِ مصطفیٰؐ کا یہ عالم تھا کہ آپ کی جھولی مبارک میں محبوبِؐ خدا سرِ انور رکھ کر آرام فرما رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کی نمازِ عصر کا وقت جا رہا ہے لیکن آپؓ نے محبوبِ خدا کے آرام میں خلل پسند نہیں فرمایا۔ اپنی نماز کو قربان کرنا گوارہ کر لیا۔ (طبرانی)

شجر و حجر اور حیوانات کی محبوبِ خدا سے محبت:۔

شجر و حجر' حیوانات و نباتات کو تاجدارِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہچان اللہ تعالیٰ نے عطا کر رکھی تھی۔ درخت' پتھر بلکہ جانور تک ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب و احترام کیا کرتے تھے اور اُن سے محبت رکھتے تھے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ جمعہ کے دن ایک خشک کھجور کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے اور خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جب منبر شریف تیار ہوا تو اگلے جمعہ کے دن نئے منبر پر تشریف لے گئے۔ اُس دن تنے کے ساتھ ٹیک نہ لگائی تو وہ خشک کھجور کا تنا بچے کی مثل چیخ چیخ کر رونے لگا۔ آہ و بکا کرنے لگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور اُس تنے کو اپنے سینہ مبارک کے ساتھ لگایا تو وہ بچوں کی مانند سسکیاں لے کر رونے لگا اور

روتے روتے چُپ ہوگیا۔(صحیح بخاری)

حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا''میں اُس پتھر کو اب بھی پہچانتا ہوں جو مکہ میں ہے اور وہ مجھے نبوت سے پہلے بھی سلام کیا کرتا تھا۔''(صحیح مسلم)

حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں جس کا مفہوم ہے کہ''میں آقاؐ کے ساتھ مکہ معظّمہ کے جنگل سے گزر رہا تھا' کوئی شجر کوئی حجر ایسا نہ تھا' جس نے حضورؐ کو سلام نہ کیا ہو۔''(جامع ترمذی)

حضرت عائشہ صدیقہؓ راوی ہیں' جس کا مفہوم ہے کہ آقاؐ مہاجرین اور انصار کے ایک گروہ میں تشریف فرما تھے۔ایک اونٹ آیا' آقا کے قدموں کے سامنے سجدہ ریز ہوگیا۔ یہ منظر دیکھ کر اصحاب محمدؐ نے فرمایا''ہمارا حق زیادہ ہے کہ ہم آپؐ کو سجدہ کریں۔لیکن آقاؐ نے منع فرما دیا۔''(احمد بن حنبل)

انسان تو انسان' شجر و حجر اور حیوانات و نباتات بھی آپؐ کی محبت سے سرشار تھے اور آپ کی عزت و تکریم کیا کرتے تھے۔

محمدؐ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی' تو ایماں نامکمل ہے

مرزا محمد بلال اصغر عطاری

الشُّکرُ اللہِ عزوجل

خُدائے اَحکَمُ الحاکمین جَلَّ جَلَالَہٗ کی بے شمار نعمتیں ساری کائنات کے ذرے ذرے پر بارش کے قطروں کی تعداد سے زیادہ' درختوں کے پتوں سے زیادہ' دنیا بھر کے پانی کے قطروں سے زیادہ ہر لمحہ' ہر گھڑی بِن مانگے طوفانی بارشوں سے تیز برس رہی ہیں جن کو شمار کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔اس کا اعلان اللہ عزوجل نے خود اپنے کلام میں یوں فرمایا:

وان تعدو انعمته الله لا تعصوهاط (سورة النحل)

ترجمہ:۔''اور اگر اللہ عزوجل کی نعمتیں گنو تو شمار نہ کر سکو گے''(کنزالایمان)

اس قدر نعمتوں کے ہجوم کا تقاضا ہے کہ بندے کی ہر ساعت' ہر سانس رب تعالیٰ کے لئے ہو' کھائے یا پیئے' دیکھے یا سُنے' چلے یا بولے' سوئے یا جاگے' الغرض! اس کا جینا اور مرنا بھی اپنے کریم ربّ تعالیٰ کے لئے ہو۔ بندے کو چاہیے کہ ہر وقت ربّ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر کرتا رہے۔حضرت سیدنا فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''کہا جاتا ہے کہ جس نے اللہ عزّوجل کی نعمت کو دل سے پہچان کر زبان سے اس کا شکر ادا کیا تو وہ شکر کے الفاظ مکمل کرنے سے پہلے ہی اس نعمت میں اضافہ دیکھ لے گا''

کیونکہ اللہ عزّ وجل کا فرمانِ عالی شان ہے:

لئن شكرتم لا زيد نكم (سورة ابراهيم)

ترجمہ:اگر احسان مانو گے تو تمہیں اور دوں گا۔(کنزالایمان)

حضرتِ علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے فرمایا: ''بے شک نعمت کا تعلق شکر کے ساتھ ہے اور شکر کا تعلق نعمتوں میں اضافے کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ پس اللہ عزوجل کی طرف سے نعمتوں کی زیادتی اس وقت تک نہیں رُکتی جب تک بندے کی طرف سے شکر نہ رک جائے۔''

تو اگر آپ نعمتوں میں فوری اضافہ چاہتے ہیں تو بس ربّ العزت کے شکر میں لگ جائیں۔ تفسیر ابنِ کثیر میں حضرت سیدنا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ''جو بندہ اللہ عزّوجل کا ذکر کرتا ہے۔ اللہ عزوجل اس کا ذکر کرتا ہے اور جو اُس کا شکر کرتا ہے تو وہ اُسے اور زیادہ عطا فرماتا ہے اور جو ناشکری کرے گا اسے وہ عذاب میں مبتلا فرمائے گا۔''

حضرت سیدنا نوح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کثرت کے ساتھ اللہ عزوجل کا شکر بجالایا کرتے، جو کام کرتے حتیٰ کہ ایک قدم بھی چلتے تو بھی اللہ عزّوجل کا شکر ادا کرتے، چنانچہ قرآن مجید میں انہیں یوں یاد کیا گیا:

انہ کان عبدا شکورا ہ (سورۃ الاسراء)

ترجمہ: بے شک وہ بڑا شکر گزار بندہ تھا۔ (کنزالایمان)

حضرت سیدنا عامر بن شراحیل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: صبر اور شکر آدھا ایمان ہے اور یقین مکمل ایمان ہے۔''

شعب الایمان میں ہے: حضرت سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تاجدارِ رسالت، شہنشاہِ نبوّت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''افضل دعا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ہے اور افضل ذکر اَلحمدُ لِلّٰہ ہے۔''

سنن ابی داؤد میں ہے کہ سید المبلغین، رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے:

الھم اعنی علی ذکرك و شکرك و حیسن عبادتك

(یعنی اے اللہ عزوجل! اپنے ذکر، شکر اور اچھی عبادت پر میری مدد فرما)

تو ہمیں بھی اس دعا کو ہر نماز کے بعد پڑھنے کی عادت بنانی چاہیے۔

المعجم الاوسط میں ہے: حضرت سیدنا انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ عزوجل کسی بندے کو اہل، مال اور اولاد کی صورت میں کوئی نعمت عطا کرے، پھر وہ کہے:

ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ

''(یعنی شکر ادا کرے) تو وہ اس نعمت میں موت کے علاوہ کوئی آفت نہیں دیکھے گا۔''

سبحان اللہ عزوجل! پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں نعمت کی حفاظت کا نسخہ ارشاد فرما دیا ہے، تو وقتاً فوقتاً اس دعا کو پڑھتے رہا کریں۔

شعب الایمان میں ہے، حضرت سیدنا ابوعقیل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سیدّنا بکر بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کو فرماتے سُنا کہ ''جب بھی بندہ اَلحمدُ لِلّٰہ کہتا ہے تو اَلحمدُ لِلّٰہ کہنے کی برکت سے اس کے لئے نعمت لازم ہو جاتی ہے۔ میں نے پوچھا ''اس نعمت کا بدلہ کیا ہے؟'' فرمایا ''اس کا بدلہ بھی بندے کا اَلحمدُ لِلّٰہ کہنا ہے۔'' پس (یہ کہتے ہی اُس کے پاس) ایک اور نعمت آ جائے گی، کیونکہ اللہ عزّوجل کی نعمتیں ختم نہیں ہوتیں۔

سبحان اللہ عزّوجل! یعنی بندہ اگر اَلحمدُ لِلّٰہ کہتا رہے تو ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا اور جب تک وہ شکر ادا کرتا رہے گا تب تک وہ نعمتوں کے سمندر میں غوطے لگاتا چلا جائے گا۔

اگر ہم اپنی زندگیوں پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ اللہ عزوجل نے بے شمار نعمتیں ہمیں عطا فرمائی ہیں۔ سب سے پہلے بڑی نعمت سے سرفراز فرمایا

یعنی ایمان کی نعمت عطا فرمائی اور مسلمان پیدا فرمایا۔ سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو اَلحَمدُ لِلّٰہ بِالِاسلَامِ کہتے ہوئے سُنا تو ارشاد فرمایا:

''بے شک تو نے اللہ عزّ وجل کی بہت بڑی نعمت کا شکر ادا کیا ہے۔''

یہی وہ نعمت ہے کہ جس پر ہماری نہ ختم ہونے والی اخروی زندگی کا دارومدار ہے۔ اگر خاتمہ ایمان پر ہوا تو ٹھیک ورنہ۔۔۔لہٰذا یہ دعا کریں کہ ''یا اللہ عزوجل! ہمارا خاتمہ بالایمان اور خاتمہ بالخیر فرما۔ آمین'' اور اس دینِ اسلام کی نعمت کی قدر کرتے ہوئے اسے دل و جان سے قبول کریں اور اپنے آپ کو اس میں ڈھالیں' نہ کہ اسے اپنے مطابق ڈھالیں۔ جیسا کہ قرآن میں اللہ ربّ العزت فرماتا ہے:

یا ایها الذین امنو ادخلو فی السلم کافته ص (سورة البقره)

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ۔ (کنز الایمان)

اللہ ربّ العزت نے اپنے پیارے اور میٹھے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں بھی ہم پر احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ اس نے ہمیں بے شمار نعمتیں عطا فرمانے کے بعد فرمایا کہ اُس نے ہم پر احسان کیا۔ خدائے حنان و منان عزوجل فرماتا ہے:

لقد من الله علی المومنین اذبعث فیهم رسولاً (آل عمران:164)

ترجمہ: بے شک اللہ کا مومنین پر بڑا احسان ہوا کہ ان میں ایک رسول بھیجا۔ بے شک یہ احسان عظیم ہے۔ ایک روایت میں ہے:

لولاك لما اظهرت ربوبیتی

جس کا مفہوم کچھ یوں ہے: کہ اگر آپ علیہ السلام کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو اپنا رب ہونا بھی ظاہر نہ فرماتا۔

معزّز قارئین! یہ نعمت جس قدر عظیم ہے اس کے تقاضے بھی اسی قدر عظیم ہیں۔ اولاً تو یہ کہ اس نعمت پر ربِ عزوجل کا شکریہ ادا کریں اور آپ کی ولادت کی خوشیاں منائیں۔ آپ علیہ السلام پر ایمان لاتے ہوئے آپ ؐ کی پیروی کریں۔ شفاء شریف میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ علاماتِ محبت بیان فرماتے ہیں۔ ''آپ ؐ کی وجہ سے نفرت کرے' آپ ؐ کے لائے ہوئے قرآن سے محبت کرے' آپ کی امت سے محبت و شفقت کرے (یعنی ان کو نیکی کی دعوت دے اور برائی سے منع کرے) کثرتِ درود پاک کرے' آپ کے روضۂ انور کی زیارت کے لئے جائے۔''

کاش! ہم میں بھی علاماتِ محبت پائی جائیں اور ان لوگوں کی صف میں جگہ مل جائے جو ان کی شفاعت پائیں گے۔ (آمین)

اللہ جلّ شانہٗ نے اس اُمتّ کو قرآن کریم کی صورت میں ایک عظیم نعمت عطا فرمائی ہے۔ اور اس کی تلاوت کرنے پر اجرِ عظیم کی بشارت دی گئی ہے۔ فرمانِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

''جو قرآن پاک کا ایک حرف پڑھے گا اس کو ایک نیکی ملے گی جو دس کے برابر ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف' لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔'' ترمذی شریف)

لہٰذا اس نعمت کا شکر اس طرح ادا کیا جائے کہ اس کی تجوید (یعنی عربی لب و لہجے میں) تلاوت کریں اور اس کو ترجمہ و تفسیر کے ساتھ پڑھیں' اس پر عمل کریں اور دوسروں تک پہنچائیں۔

اگر ہم اپنی ذات پر توجہ کریں تو سر سے لے کر پاؤں تک ہمارا تندرست و توانا جسم بھی تو اُس ذاتِ پاک کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہمیں اس نعمت کا بھی شکر ادا کرنا چاہیے اللہ عزوجل ہمیں ہر حال میں اپنا شکر ادا کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

حافظ آصف خلیل

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزاح

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ دن بدن نت نئے انداز سے آپ کی سیرت مبارکہ کے مختلف گوشوں کو محبت وعقیدت سے اجاگر کیا جارہا ہے۔ افسردہ دل کو خوش کرنا سنّت نبوی ہے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی ذات اقدس پر نبوت کی اس قدر بھاری ذمہ داری تھی کہ آپ کو مباح کام کرنے اور مزاح کا موقع ہی نہیں ملا ہوگا لیکن ایسا نہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے جس میں آپ کی مسکراہٹ اور مزاح عیاں ہے۔ ذیل میں چند واقعات آپؐ کی سیرتِ طیبّہ سے اس نایاب اور دلکش پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔

حضرت صہیبؓ کی بات

ایک دن حضور نبی اکرمؐ اپنے صحابہ اکرام کی مجلس میں تشریف فرما تھے سامنے کھجوریں رکھی ہوئی تھیں اسی اثنا میں حضرت صہیبؓ آئے ان کی آنکھیں درد کر رہی تھیں۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی آتے ہی صحابہ کرامؓ کے ساتھ کھجوریں کھانا شروع کر دیں۔ یہ دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا تم میٹھا کھا رہے ہو حالانکہ تمہاری آنکھیں دُکھتی ہیں۔ اس پر حضرت صہیبؓ کہنے لگے یا رسول اللہ! میں اس طرف کھاتا ہوں جس طرف سے میری آنکھ میں درد نہیں ہے۔ حضور اکرمؐ ان کی اس بات پر بہت مسکرائے اور مسکراتے رہے۔

آنکھ میں سفیدی

ایک عورت نبی اکرمؐ کی بارگاہِ اقدس میں آئی اور کہنے لگی یا رسول اللہؐ! میرا شوہر بیمار ہے اور آپؐ کو یاد کرتا ہے۔ آپؐ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا۔ اوہو! اس کی آنکھ میں تو سفیدی ہے۔ وہ عورت دوڑی دوڑی گھر واپس گئی اور اپنے شوہر کی آنکھوں کو دیکھنے لگی شوہر نے کہا کیا دیکھتی ہو؟ کہنے لگی! حضورؐ نے فرمایا ہے تمہاری آنکھوں میں سفیدی ہے۔ اس کے شوہر نے کہا اے اللہ کی بندی! حضورؐ نے سچ فرمایا ہے ہر ایک کی آنکھ میں سفیدی ہوتی ہے۔

بوڑھوں کی جنّت

ایک بوڑھی عورت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسولؐ اللہ دعا فرمائیں کہ مجھے جنت میں جگہ مل جائے۔ آپؐ نے مسکرا کر فرمایا ''کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی'' یہ سن کر بوڑھی عورت بہت افسردہ ہوئی اور رونے لگی۔ حضورؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالی قیامت کے دن تمام عورتوں کو جوان بنا کر جنت میں بھیجے گا''۔

حضور اکرمؐ کا دوڑ لگانا

نبی پاکؐ کی سیرت طیبہ کا یہ پہلو ملاحظہ ہو کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اللہ کے رسولؐ کے ساتھ دوڑ لگائی اور آپؐ سے میں آگے نکل گئی۔ کچھ مدت بعد میں نے دوبارہ حضورؐ سے دوڑ نے میں مقابلہ کیا اس مرتبہ نبی اکرمؐ مجھ سے آگے نکل گئے۔ پھر (دوڑ کے اختتام پر) آپؐ نے میرے کندھوں پر دستِ اقدس پھیرتے ہوئے مسکرا کر فرمایا عائشہؓ! حساب برابر ہو گیا یہ (آج کا مقابلہ) پہلی مرتبہ کا بدلہ ہے۔

نوید عباس

مشعلِ راہ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت مومن کے ایمان کی روح ہے۔ آپؐ کے توسط سے ہی ہمیں ایمان کی دولت ملی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین حق کی تبلیغ وترویج میں بہت مشکلات برداشت کیں۔ کبھی ان کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے تو کبھی طائف کے آوارہ نوجوانوں نے پتھروں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لہولہان کیا۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کے بعد یقیناً اسی محبت کا درجہ ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے۔ (صحیح البخاری حدیث نمبر 14)

لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و والدہ والناس اجمعین

''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی نظر میں اس کے والدین، اس کی اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر عزیز نہ ہوجاؤں''

گویا جس شخص کو نبیؐ سے محبت نہیں وہ ایمان والا ہی نہیں۔ آج کل ہر شخص دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے نبی اکرمؐ سے عشق ہے اور میں اُن کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ قانون فطرت ہے کہ جس شخص سے محبت کی جاتی ہے اُس کا ہر حکم مانا جاتا ہے، اس کی بات حرفِ آخر سمجھی جاتی ہے۔ اُس کی باتوں پر عمل کرنے میں کوئی دیر نہیں لگاتا ہے۔ اس کے لئے محبّ کو دریا میں بھی کودنا پڑے تو وہ کود جائے۔ ذرا غور کیجئے ہم رسول اللہؐ سے محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن کیا ہماری اس بات میں سچائی موجود ہے؟ میرے خیال میں ''نہیں بہت زیادہ حد تک نہیں''

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے مگر یہ عظیم نعمت ہمیں ہمارے پیارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی حاصل ہوئی اِسی کے بارے میں آپؐ نے فرمایا جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور دوسروں کو سکھایا۔

اِسی آخری کتاب میں اللہ تعالیٰ نے بارہا ارشاد فرمایا

اطیعو اللہ و اطیعو الرسول

''اطاعت کرو اللہ کی اور اُس کے رسولؐ کی''

قرآن کریم میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں پر صرف اللہ کی اطاعت کا حکم ہو۔ جہاں بھی اللہ کی اطاعت کا حکم ہوا وہیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا بھی حکم ہوا۔ اِس آیت کی رُو سے کامیاب زندگی گزارنے کے لیے جن دو اشیاء کی اشد ضرورت ہے وہ یہ ہیں:۔

(1) اللہ کی اطاعت

(2) رسول اللہؐ کی اطاعت

قرآن کی تعلیمات اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں اور اِس کی پیروی کرنے سے جو چیز پوری ہوتی ہے وہ ہے اللہ کی اطاعت۔

دوسری اہم چیز اطاعتِ رسولؐ ہے اور رسولؐ کی زندگی تمام انسانیت کے لیے نمونہ ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

''بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے''

قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم ہے کہ جس نے رسول اللہؐ کی اطاعت کی اُس نے گویا اللہ کی اطاعت کی۔ اِسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا!

''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا جو کچھ قرآن میں ہے وہی حضورِ اکرمؐ کے اخلاق تھے''

گویا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کی عملی تصویر تھے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اِرشاد فرمایا آپؐ نے اُسے کر دکھایا۔

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے نبی اکرمؐ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ چاہے کوئی امیر ہے یا غریب' بادشاہ ہے یا فقیر' کسی فوج کا سپہ سالار ہے یا کسی درسگاہ کا معلّم' واعظ و ناصح ہے یا مصنّف' بیویوں کا شوہر ہے یا بچوں کا والد' الغرض جو کوئی بھی ہے اُس کی کامیاب زندگی کے لیے بہترین نمونہ اور سیرت کی درستگی کے لیے سامان' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے خزانے میں موجود ہے۔

حافظ محمد سہیل اکرم

نماز کی اہمیّت

قرآن کریم میں بارہا مقامات پر حکم ہے واقیموُ الصلوۃ

''اور نماز قائم کرو''۔ نبی کریمؐ کا اسوہ یہی سکھاتا ہے کہ جھکو اس ذات کے حضور جس نے پیدا کیا۔ صحابہ کرامؓ نے زندگیوں میں مثالیں چھوڑیں کہ کچھ بھی ہو جائے نماز میں غفلت نہ کرو۔ تاریخِ اسلام ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ آخری وقت میں بھی نماز نہ چھوڑو۔ انبیاء کرامؑ نے یہی سکھایا کہ کامیابی نماز میں ہے۔ پیغمبروں نے اپنی تعلیمات میں یہی درس دیا کہ زندگی نماز میں ہے۔

باوجود اس کے جب اذان ہوتی ہے' بلاوائے خداوندی آتا ہے' موذّن صدائے اذان بلند کرتا ہے ''حی علی الفلاح' آؤ کامیابی کی طرف'' فضا میں اللہ اکبر کی صدا مسلسل گونجتی رہتی ہے مگر ہم اپنے معمولات میں ایسے مشغول رہتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایک نماز کو چھوڑ کر انسان جس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اسے خبر نہیں اور ہم یکے بعد دیگرے دل پر داغ لگاتے چلے جاتے ہیں اور ایک دن ہمارا دل گناہوں کے داغ سے کالا پڑ جاتا ہے اور وہ لمحہ آن پہنچتا ہے جب توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے' جسم اور روح کے الگ ہونے کا لمحہ آتا ہے' آنکھیں تو کھلی رہتی ہیں مگر سانسوں کا سلسلہ تھم جاتا ہے۔ پھر نکیرین سوال کرتے ہیں اور ہم انہیں ٹکٹکی باندھے بے یارومددگار دیکھتے رہتے ہیں۔ آخر ہمارا ابدی ٹھکانہ ہمیں مِل جاتا ہے۔ تب جہنمی لوگ سوال کرتے ہیں تم یہاں کیونکر پہنچ گئے۔ جواب دیا جائے گا۔

"لم نك من المصلين"

''ہم نماز نہیں پڑھتے تھے''

اے ابن آدم ڈر اس وقت سے اور پیشگی تیاری کر رہ۔

نوید عباس

میٹھے بول

حضرت ابوموسیٰ ؓ روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے حضور اکرمؐ سے دریافت کیا ''سب سے اچھا مسلمان کون ہے'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِرشاد فرمایا ''تم میں سے سب سے اچھا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں''

ہر بات کو بیان کرنے کے لیے مختلف قسم کے الفاظ اور انداز استعمال کیے جاتے ہیں کچھ ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو آدمی کے تن بدن میں آگ لگا دیتے ہیں اور غصّہ دلاتے ہیں اور اُسی بات کو ایسے الفاظ اور انداز سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے جس سے سُننے والے پر بہت اچھا اثر ہوتا ہے۔ اِسی بات کی وضاحت کے لیے ذیل میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

خراسان کے ایک بزرگؒ کو خواب میں حکم ہوا: ''تاتاری قوم میں اسلام کی دعوت پیش کرو!'' اُس وقت ہلاکو خان کا بیٹا تگودار خان برسرِ اقتدار تھا۔ وہ بزرگؒ سفر کر کے تگودار خان کے پاس تشریف لے آئے۔ سنتوں کے پیکر باریش مسلمان مبلّغ کو دیکھ کر اسے مسخری سوجھی اور کہنے لگا: ''میاں یہ تو بتاؤ تمہاری داڑھی کے بال اچھے یا میرے کُتے کی دُم؟'' بات اگرچہ غصہ دلانے والی تھی مگر چونکہ وہ ایک سمجھدار مبلّغ تھے لہٰذا نہایت نرمی کے ساتھ فرمانے لگے: ''میں بھی اپنے خالق و مالک کا کُتا ہوں اگر جانثاری اور وفاداری سے اسے خوش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو میں اچھا ورنہ آپ کے کُتے کی دُم مجھ سے اچھی ہے جبکہ وہ آپ کا فرمانبردار ہو' چونکہ وہ عالمِ باعمل تھے' غیبت و چغلی' عیب جوئی اور بدکلامی نیز فضول گوئی وغیرہ سے دور رہتے ہوئے اپنی زبان ذکر اللہ سے ہمیشہ تر رکھتے تھے لہٰذا ان کی زبان سے نکلے ہوئے میٹھے بول تاثیر کا تیر بن کر تگودار خان کے دل میں پیوست ہو گئے کہ جب اس نے اپنے ''زہر ملے کانٹے'' کے جواب میں اس باعمل مبلّغ کی طرف سے ''خوشبودار مدنی پھول' پایا تو پانی پانی ہو گیا اور نرمی سے بولا: آپؒ میرے مہمان ہیں میرے ہی یہاں قیام فرمائیے۔ چنانچہ آپؒ اس کے پاس مُقیم ہو گئے۔ تگودار خان روزانہ رات کے وقت آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ آپؒ نہایت ہی شفقت کے ساتھ اسے نیکی کی دعوت پیش کرتے۔ آپؒ کی سعی پیہم نے تگودار خان جو کل تک اسلام کو صفحہء ہستی سے مٹانے کے در پے تھا آج اسلام کا شیدائی بن چُکا تھا۔ اسی باعمل مبلّغ کے ہاتھوں تگودار خان اپنی پوری تاتاری قوم سمیت مسلمان ہو گیا۔ اس کا اسلامی نام ''احمد'' رکھا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک مبلّغ کے میٹھے بول کی برکت سے وسط ایشیاء کی خونخوار تاتاری سلطنت اسلامی حکومت میں بدل گئی۔

اللہ عزوجل کی اُن پر رحمت ہو۔ آمین

سلمان فلك

مسیحا

قرآنِ پاک کی آیت مبارکہ ہے:

ترجمہ:''جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی (اللہ) مجھے شفاء دیتا ہے''

اس کائنات میں اللہ ہی مسیحا ہے۔ اس کی مسیحائی' جسمانی' روحانی' معاشرتی' معاشی اور کردار کی تمام ظاہری و باطنی بیماریوں پر محیط ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اپنا ہاتھ پھیر کر مردوں کو زندہ کرتے' اندھوں' کوڑھ اور برص زدہ مریضوں کو بہ حکم الٰہی شفایاب کر دیتے تھے۔ اسی نسبت سے انہیں مسیح کہا جاتا ہے۔

ہر درسگاہ کا میگزین اس کے فنی حسن اور تخلیقی لطافت کا آئینہ دار ہوتا ہے' لہٰذا میں یہ جسارت کر رہا ہوں کہ اس مجلّہ کے ذریعے اپنے ہم سفروں کو اس ابدی پیغام سے آشنا کروں جس کے لئے قدرت نے ان کو چُنا ہے۔ یہ قدرت کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے ہمارا شمار مسیحاؤں کی فہرست میں کر دیا ہے۔

ذرا ایک لمحے کے لئے سوچیئے کہ اگر قدرت ہمیں عقلِ سلیم عطا نہ کرتی' ہمیں اچھے استاد اور اچھے ادارے میسر نہ آتے سب سے بڑھ کر اگر علم دوست والدین کا قرب نصیب نہ ہوتا تو آج ہم بھی کسی فیکٹری کے مزدور' کسی چراگاہ کے چرواہے' کسی جاگیردار کے کامدار' کسی وڈیرے کے ذاتی ملازم' یا کسی دُکان پر سیلز مین ہوتے۔

نہ ہمیں پُرتعیش زندگی کا ادراک ہوتا۔ نہ ہمیں سدا بہار رنگینیوں کا جلوہ ملتا۔

میرے انتہائی قابلِ احترام ہم سفرو! ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ جب عملی زندگی میں رواں ہوں گے تو ہمیں ہر کوئی ڈاکٹر کے لقب سے پُکارے گا' ہماری شفیق نظر کا منتظر ہوگا' ہماری تسلّی سے سکون پائے گا' ہمارے پیار کا لہجہ اسے زندگی عطا کرے گا۔

ان حالات میں' میں یہ عرض کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا کہ میرے پیارے وطن میں مادہ پرستی کا بھوت بامِ عروج پر ہے۔ اس مادہ پرستی کے جنون نے ہمارا سکون چھین لیا ہے۔ جذبۂ ہمدردی اور دوسروں کے لئے جینے کی سوچ دم توڑ چکی ہے۔ مسیحا اپنی فیس کی خاطر کسی زخمی چہرے سے کپڑا ہٹا کر نہیں دیکھتے کہ وہ کہیں ان کا اپنا بیٹا ہی تو نہیں۔ کئی ایسے واقعات تاریخ کے اوراق میں کندہ ہیں جنہیں پڑھ کر انسان کے انسان نہیں' ہوس کا پجاری ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کرنے کے لئے پیدا کیا تھا۔

ارشادِ پاک ہے کہ:۔

''جس نے ایک انسان کی جان بچائی گویا اُس نے ساری انسانیت کو زندہ کر دیا''

میرے ہم سفرو! ایسے واقعات کا اعادہ نہ ہونے دیں کہ ایک ماں کا جواں سال بیٹا' ایک بہن کا پردہ' ایک کم سن بیٹی کی آس اور ایک جوان خاتون کے سر کا تاج ان کے سامنے زندگی کی بازی ہار رہا ہو اور ڈاکٹر صاحب فیس کے چکر میں اُن کو اپنے پیارے کی لاش بھی نہ اٹھانے دے رہے ہوں۔

ان حالات میں آپ پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔آپ کی قوم آپ کی نیم وا آنکھوں سے کئی سوال پوچھ رہی ہے۔اس لئے جب آپ یہاں سے فارغ التحصیل ہوکر جائیں تو خدارا ذاتی سوچ کو اپنا رفیق نہ ہونے دینا۔بلکہ اہلِ وطن کو یہ پیغام دینا کہ ہمارے بڑوں سے جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ہم ان پر شرمندہ ہیں اور ہم اُن کا اعادہ نہیں ہونے دیں گے۔ہمارا سکون آپ کے سکون میں پوشیدہ ہے۔ہمارا اضطراب آپ کے مضطرب ہونے میں ہے۔آپ کے آنسو ہمارے آنسو ہیں۔کوئی کمزور دستک بھی ہمیں مسیحائی سے نہ روک سکے گی۔آپ اپنے دل میں عہد کریں کہ آپ مسیحا کے روپ میں جئیں گے۔اور آنے والی نسلوں کو ابدیّت کا پیغام دے کر آپ اس دنیائے فانی سے کوچ کریں گے۔

قابلِ احترام مستقبل کے مسیحا صاحبان! میری ان سطور کو شبنم کے قطرے سمجھ کر ان سے ٹھنڈک محسوس کرنا کیونکہ اسی میں انسانیت کی فلاح ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حقیقت میں مسیحا بنا دے تا کہ ہم امر ہو جائیں۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

ھما جاوید

چودہ خصلتیں

امیر المومنین حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

''جب میری اُمت میں چودہ خصلتیں پیدا ہوں گی تو اِس پر مصیبتیں نازل ہونا شروع ہو جائیں گی۔''

دریافت کیا گیا یا رسول اللہؐ وہ کیا ہیں؟ فرمایا:

1۔جب سرکاری مال ذاتی ملکیت بنا لیا جائے۔

2۔ امانت کو مالِ غنیمت سمجھا جائے۔

3۔ زکواۃ جرمانہ محسوس ہونے لگے۔

4۔ شوہر بیوی کا مطیع ہو جائے۔

5۔ بیٹا ماں کا نافرمان ہو جائے۔

6۔ آدمی دوستوں سے بھلائی کرے اور باپ پر ظلم ڈھائے۔

7۔ مساجد میں شور مچایا جائے۔

8۔ قوم کا ذلیل ترین آدمی اس کا سربراہ ہو۔

9۔ آدمی کی عزت اُس کی برائی کے ڈر سے ہونے لگے۔

10۔ مرد ریشم پہنیں۔

11۔آلاتِ موسیقی اختیار کیے جائیں۔

12۔رقص وسرور کی محفلیں سجائی جائیں۔

13۔اِس وقت کے لوگ اگلوں پر لعن طعن کریں۔

14۔نشہ آور اشیاء کُھلم کُھلا استعمال ہونے لگیں۔

تو پھر لوگوں کو چاہئے کہ وہ ہر وقت عذابِ الٰہی کے منتظر ہوں۔خواہ وہ سرخ آندھی کی شکل میں آئے یا زلزلے کی شکل میں۔

سیّدہ فوزیہ

اقبال کا تصوّرِ مومن

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی بُرہان!
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!

اقبال ایک شاعر ہیں اور فلسفی بھی، ان کی شاعری سے انسانی شخصیت کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے برصغیر پاک و ہند کی کایا پلٹ دی۔ ان کی شاعری میں سوچ اور فکر کی گہرائی و گیرائی نظر آتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے بہت سے موضوعات کا احاطہ کیا لیکن تقابل علم و عشق ان کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔ ان کے خیال میں عشق کی تلوار علم کی نیام میں پیوست ہے اور جس کے پاس یہ تلوار موجود ہے وہی انسانیت کی معراج تک پہنچتا ہے۔

اقبال کا خیال تھا کہ مومن ہونا ہی انسانیت کی معراج ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مومن کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ چاہے وہ خودی کا فلسفہ ہو یا عشق کا، ہر ایک مومن کی شخصیت کو مزید واضح کرتا ہے۔ انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات اس لیے بنایا ہے کہ وہ عقل رکھتا ہے لیکن اقبال کے نزدیک وہ اپنی معراج تک تب پہنچتا ہے جب وہ عشق کی منزل کو پالیتا ہے۔ اس لیے اقبال نے نہ صرف علم اور عشق کا موازنہ کیا بلکہ مومن اور انسان کے فرق کو واضح کرنے کے لئے انہوں نے عقل اور عشق کو بھی مدِ مقابل ٹھہرایا۔ گویا ان کے ہاں عقل و عشق کی ایک ٹکر نظر آتی ہے، جو ہر مقام پر ان کی شاعری میں جلوہ نما ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

عقل ان کے نزدیک خام ہے کیوں کہ وہ سود و زیاں کا سفر طے کرتی ہے جبکہ عشق پختہ ہے کیوں کہ وہ تخمین و ظن کی حدوں سے نکل چکا ہے۔ عقل کی بدولت انسان جانوروں کی صف سے تو نکل جاتا ہے لیکن عشق اسے انسانیت کی معراج تک پہنچانے کا وسیلہ ہے۔ عقل حقیقت کو دھندلائے رکھتی ہے اور عشق حقیقت کو ہمیشہ واضح رکھتا ہے اور یہی عشق مومن کا خاصہ ہوتا ہے۔

حوالے کے لیے یہ شعر ملاحظہ ہو۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

تاریخ کے صفحات پر اگر نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں کئی مومن راہِ عشق پر

گامزن نظر آتے ہیں۔حضرت ابراہیمؑ کو ہی لیجئے جب انہیں آگ میں پھینکا گیا تو آپؑ نفع ونقصان کی پرواہ کئے بغیر اس میں کود پڑے کیونکہ آپ کا خاصہ عقل اس راہ میں سب سے آگے ہے۔انہوں نے خدا سے عشق کی خاطر اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جانوں کی بھی پرواہ نہ کی اور اقبال نے انہیں اس انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت جس کی حسینؓ، ابتداء ہے اسماعیلؑ
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکہء وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

غرضیکہ مومن ایمان واتحاد، فقر وغناء، شجاعت وصولت، عدالت وسخاوت، اخوت وبھائی چارہ، حلقہء یاراں میں ریشم کی طرح نرم اور رزمِ حق وباطل میں فولاد کی مجسّم تصویر ہوتا ہے۔اس کے سامنے صحرا و دریا دو نیم اور پہاڑوں کی ہیبت پستی میں سمٹ جاتی ہے اور یہی مومن خدا کے ہاں فرشتوں سے کئی گُنا زیادہ بلند مقام ومرتبے کا حامل ہوتا ہے۔

ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کُنجشک وحمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیّاد ہے مومن

محمد ارسلان احمد

میں نے رُلتے ہوئے کیچڑ میں گُہر دیکھے ہیں

وہ 11 دسمبر 2007ء کی یخ بستہ صبح تھی۔گھڑی کا الارم چیخ رہا تھا۔میرا جی بستر چھوڑنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔لیکن روشن مستقبل کی اُمید نے حال کی سختی کو برداشت کرنے پر آمادہ کیا اور جسم میں حرارت پیدا کی۔ میں نے بستر چھوڑا، بستہ پکڑا اور کالج کی جانب رختِ سفر باندھا۔ایک ماہ قبل میرا آرمی میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تھا اور میں اپنے والد کے ساتھ خیابانِ سرسید میں مقیم تھا۔کچھ دیر گاڑیوں کے سٹاپ پہ کھڑا رہا مگر کوئی گاڑی نہ ملی، لہٰذا پیدل چل پڑا۔نالہ لئی کے پُل سے گزر ہوا۔سخت تعفّن کی وجہ سے میں نے رومال اپنی ناک پر رکھ لیا۔

لئی کے کنارے آباد کچی بستی میں زندگی کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ ایک جھونپڑی کے قریب آگ جل رہی تھی اور چند بچے اس آگ کے الاؤ کے قریب کھڑے سردی کی عفّریت کو بھگانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔اُن کے معصوم چہرے حالات کی ستم ظریفی کے ہاتھوں ستائے ہوئے تھے۔اُن کے جسموں پر ناکافی لباس اُن کے افلاس کی کہانی سُنا رہا تھا۔

چند قدم آگے چلا تو دیکھتا ہوں کہ دو بچے گندی سی بوریاں اُٹھائے کُوڑے کے ڈھیر سے بوتلیں' کاغذ' اور دیگر اشیاء اکٹھی کر رہے تھے۔ یہ پلاسٹک کی خالی بوتلیں' ٹوٹے ہوئے کھلونے' پیپسی کے خالی ٹن!۔۔۔ اُن کے اور اُن کے خاندان کا رزق تھا جو وہ اس کوڑے کے ڈھیر سے چُن رہے تھے۔

اُن میں سے ایک کی نظر مجھ پر پڑی اور ٹھہر گئی۔ وہ میرے یونیفارم اور بستے کو دیکھنے لگا۔ اُس کی حسرت بھری آنکھوں میں بہت سے سوال تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہوں' تمہارے ہاتھ میں بستہ ہے اور میرے ہاتھ میں کچرے کی بوری' ایسا کیوں ہے؟ تمہارے تن پر یونیفارم اور میرے جسم پر چیتھڑے' ایسا کیوں ہے؟ تمہارے نصیب میں علم کے خزانے سمیٹنا اور میری قسمت میں گندگی کے ڈھیر سے رزق چُننا' ایسا کیوں ہے؟ تمہارا سفر حصولِ علم کے راستے پر چلتے ہوئے آسمان کی بلندیوں کی جانب اور میرا گندگی کے کیڑے کی طرح کُوڑے کے ڈھیر کی جانب ایسا کیوں ہے؟ میں اِن نظروں میں چھپے کرب کی تاب نہ لا سکا۔ اِن کی نمی میں موجود سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

سارا راستہ میں یہی سوچتا رہا کہ کیا یہ سب کچھ اس معصوم کی قسمت میں لکھا تھا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یقیناً یہ کاتبِ تقدیر کا لکھا ہوا ظلم نہ تھا بلکہ وہ تو ظلم کو سخت ناپسند کرتا ہے اور ظالموں کے خلاف آواز بلند کرنے کا حکم دیتا ہے۔ وجہ کچھ اور ہے۔ شاید اس کے حصے کا کھانا کسی وڈیرے کے کُتے کھا جاتے ہیں۔ اس کے حصے کا لباس (جو اس کے اپنے ملک کے کارخانے بناتے ہیں) امریکہ میں بیٹھے Tom & Harry پہن لیتے ہیں۔ اس کے حصے کا آم اور کینو یورپ کی منڈیوں کی زینت بن جاتا ہے اور اس کے حصے کا علم' بڑے بڑے پرائیویٹ سکولوں میں مہنگے داموں فروخت ہو جاتا ہے۔

آج ہم لوگ اپنی عمارتوں کی بڑی بڑی اور مضبوط دیواریں بناتے ہیں' اُن پر خاردار تاریں لگاتے ہیں' (رکاوٹیں) بیریئر تعمیر کرتے ہیں' جدید ترین حفاظتی انتظامات کرتے ہیں کیونکہ ہمیں دہشتگردی سے خطرہ ہے۔ مگر اس سے بھی بڑا خطرہ وہ معصوم بچے' ان کے بوسیدہ کپڑے ہیں' کہ اگر آج اِنہیں اِن کے حصّے کے کپڑے نہ مِلے تو کل یہ ہمارے بدن سے لباس نوچ لیں گے۔ آج اِنہیں اِن کے حصّے کا کھانا نہ مِلا تو کل یہ ہمارے منہ سے نوالہ چھین لیں گے۔ اگر آج اِنہیں اِن کا سائبان نہ مِلا تو کل یہ ہمارے وسیع گھروں اور اُونچی عمارتوں کو جلا کر راکھ کر دیں گے اور اگر آج انہیں اِن کے حصے کی تعلیم نہ ملی تو کل یہ ہماری لائبریریاں اور سکول اُجاڑ ڈالیں گے۔

اور سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اللہ سبحان و تعالیٰ نا انصافی اور ظلم کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ اپنے بندوں کی آہ ضرور سنے گا۔ اور پھر اگر اس نے اپنی زمین کو چند ساعتوں کی جُنبش کا حکم دے دیا یا اپنی ہواؤں کو بھرپور طاقت سے چلنے کا حکم دے دیا یا اپنے دریاؤں کو ہماری بستیوں کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدیا یا اپنی کسی خوردبینی مخلوق کو حکم دیدیا کہ وہ ہمیں بیمار کرے اور ہماری کوئی دوا اُس پر اثر نہ کرے تو جناب پھر کچھ بھی نہیں بچے گا نہ گھر اور نہ گھر والے!۔

پاکستانیات

مختار مسعود ☆

نظریۂ پاکستان ـــــ زندہ ہے، زندہ رہے گا

مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریباً ساڑھے سات سو سال جم کر حکومت کی۔ اس کے بعد سو برس انہیں اس سلطنت کے مختلف علاقے کھو دینے میں لگے۔ یہاں تک کہ حکومت سمٹ کر شاہی قلعے تک محدود ہو گئی۔ انگریزوں نے بادشاہ کو جلا وطن کر دیا۔ 1857ء کے بعد نوے برس تک انگریز نے خوب مزے سے حکومت کی۔ جب انگریز کی رخصتی کا وقت آیا تو کاروبارِ سلطنت کا مسئلہ پیچیدہ ہو چکا تھا۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کے لئے طرزِ حکومت کا انتخاب ایک بالکل نیا اور اہم تاریخی مرحلہ تھا۔ بادشاہت سے جمہوریت تک کے سفر کے لئے جو وقت درکار تھا، وہ برعظیم کو میسر نہ آیا۔ جب ترقی یافتہ ملک اس سفر کی منزلیں طے کر رہے تھے، یہ برعظیم انگریزوں کی غلامی سے دو چار ہو گیا۔ آزادی کی جدوجہد کامیابی کے نزدیک پہنچی تو پتہ چلا کہ اس کی دو شکلیں ہیں۔ یہ بات ان دنوں شاید کم لوگ جانتے تھے کہ آزادی کی جو شکل انگریزوں کی حکومت کے ختم ہونے پر متعین ہوگی، وہ صدیوں تک اس برعظیم کی تاریخ پر اثر انداز رہے گی۔ مسلمانوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ سیاسیات کی فکر جدید اور نظامِ حکومت کی طرزِ جدید کے مطابق اپنی منزل کا انتخاب کریں۔ جمہوریت کی نئی اور مسلمہ حقیقت کا گہرا اور دوررس جائزہ ضروری ہو گیا۔ جدیدیت کا تقاضا تھا کہ ہم بظاہر وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے ایک اقلیت بنا کر دوسرے درجے کے شہری بن جائیں۔ اس صورت کو نافذ اور مستقل کرنے کے لئے انگریز اور ہندو نے بڑی عالمانہ اور عیارانہ کوششیں کیں۔ اس کے لئے ایک طرف اتحاد، وطن اور اخوت کے گیت سنائے گئے اور دوسری جانب پاکستان کو غیر یقینی صورت اور یقینی غربت سے ڈرایا گیا۔ بڑے بڑے پنڈتوں نے خانہ جنگی، تبادلۂ آبادی اور پھر دونوں ملکوں کے درمیان خوفناک جنگوں کی بھی پیش گوئی کی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگست 1947ء میں اس برعظیم کی حکومت میں مسلمانوں کو کیا حصہ ملے گا؟ مگر اس فیصلے پر ایک بہت طویل مستقبل کا انحصار تھا۔ مسلمانوں کی قیادت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ حکومت میں نہیں بلکہ برعظیم میں حصہ مانگیں گے۔ جس نے یہ مطالبہ سنا، حیرت ہوئی۔ بیشتر کو مسلمان اقلیت کی اس جرات پر اور کچھ لوگوں کو مسلم قیادت کی اس فراست پر۔ اسی فیصلے کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں۔ نظریہ پاکستان کو چند لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب برعظیم میں پہلا شخص مسلمان ہوا، اس روز پاکستان وجود میں آ گیا تھا اور جب تک اس سرزمین پر ایک مسلمان بھی موجود ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ پاکستان قائم رہے گا۔ نظریۂ پاکستان اور مملکت پاکستان دو مربوط مگر مختلف حقیقتیں ہیں۔ جو لوگ ان میں فرق نہیں کرتے وہ سقوط ڈھاکہ کے بعد کہنے لگے کہ ایک خطۂ زمین کے ہاتھ سے نکل جانے کے ساتھ یہ نظریہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ یہ لوگ قائدِ اعظمؒ اور ان کے نظریے کو نہیں سمجھے۔ سرحدیں مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں مگر یہ نظریہ تو ایک بنیاد ہے جو ہمیشہ کے لئے بھری جا چکی ہے۔ اس پر آنے والے لوگ حسبِ توفیق عمارتیں بناتے رہیں گے۔ کبھی چھوٹی، کبھی بڑی، کبھی بہت بڑی۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان نصف ہو گیا تو اس نظریئے کی اہمیت دوچند ہو گئی۔

☆ جناب مختار مسعود پاکستان سول سروس کے درخشندہ ستاروں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے ملک اور بیرونِ ملک اہم عہدوں پر فائز رہ کر پاکستان کا نام بلند کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نامور دانشور اور بہت زیادہ پڑھی جانے والی بلند پایہ کتب کے مصنف بھی ہیں۔

پروفیسر فتح محمد ملک☆

پاکستان کا تھنک ٹینک

پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو مٹا دینے کی قلمی مہم ایک بار پھر زوروں پر ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد ہمارے ہاں روسی اشتراکیت کے ثنا خواں ترقی پسند دانشوروں میں ایک نئی صف بندی عمل میں آئی ہے۔ سابق انڈو سوویت لابی نے نیا روپ دھار لیا ہے۔ مغربی ممالک کی مالی اور نظریاتی سرپرستی میں قائم این جی اوز (غیر سرکاری تنظیمیں) اس نئی لابی کے افراد کی محفوظ کمیں گاہیں ہیں۔ مغرب نوازی اور بھارت نوازی ان این جی اوز کے سکّہ رائج الوقت کے دو رُخ ہیں۔ جو لوگ یونان کی قدیم تاریخ سے شناسائی رکھتے ہیں، انہیں یاد ہو گا کہ دشمن لکڑی کا ایک گھوڑا (ٹروجن ہارس) لے کر شہر میں داخل ہو گیا تھا۔ لوگ مارے حیرت اور استعجاب کے اس خوبصورت کھلونے کو دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے تھے مگر جب لکڑی کے اس گھوڑے کے دروازے اچانک کھلے تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اندر موجود دشمن کی فوج کے سپاہی باہر ابل پڑتے تھے اور لڑائی شروع ہو گئی۔ پاکستان میں کام کرنے والی مغربی این جی اوز میں سے بیشتر اس ٹروجن ہارس کی مثال ہیں۔

بعض اہلِ دانش کی آنکھوں میں ڈالر کی چکا چوند ہے اور یوں وہ اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے فکر وخیال کی فوجوں کے ان سپاہیوں کو پہچاننے سے قاصر ہیں جو لکڑی کے ان گھوڑوں کے اندر سے مسلسل برآمد ہوتے آ رہے ہیں اور جن کے وجود سے شہرِ خیال میں نظریاتی کشت وخون اور فکری انتشار وانحراف کا عالم انتہائی دردناک مناظر پیش کر رہا ہے۔ آئے دن ایسے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں جن کا مقصد پاکستان کی نظریاتی اساس اور ہماری منفرد قومی وملی شناخت کو معرضِ شک میں ڈالنا ہے۔

ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہمارے دانشور فوجی حکومتوں اور حکمرانوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر اپنے ملک کے دفاع کے حوالے سے غیروں کے انتہائی نامعقول مطالبات ونظریات کا جواب دینے سے کتراتے بلکہ شرماتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ افواجِ پاکستان ہماری آزادی اور غلامی کے درمیان ایک دیوار ہیں۔ دشمن اس دیوار میں دروازے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسے کمزور کر کے بالآخر گرا دینا چاہتا ہے۔ ہمیں خبردار رہنا چاہیے کہ اگر خدانخواستہ یہ دیوار گری تو ہم آزادی سے محروم ہو کر غلامی کے دور میں پہنچ جائیں گے۔ گلشن سے قفس فقط ایک دیوار کی دوری کا نام ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس دیوار کو سیسہ پلائی دیوار بنا دیں نہ کہ غیروں کے فریب میں آ کر اسے ریت کی دیوار بنانے میں مصروف ہو جائیں۔

ہمیں اعترافِ گناہ کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ اُمّتیں اور بھی ہیں، اُن میں گناہگار بھی ہیں۔ ایسی ریاستیں بھی ہیں جو چوری چکاری کی معیشت اور مانگے تانگے کے دفاع پر زندہ ہیں، مگر ریاست کی ناکامی کے نظریہ ساز صرف اور صرف پاکستان پر کرم فرمائی میں مصروف ہیں۔ عامتہ المسلمین پاکستان کے ''دانا دوستوں'' اور

☆ سابق استاذِ پاکستانیات قائدِ اعظمؒ یونیورسٹی اسلام آباد، کولمبیا یونیورسٹی نیویارک، ہائیڈل برگ یونیورسٹی، ہمبولڈن یونیورسٹی برلن، سینٹ پیٹرز برگ یونیورسٹی۔ صدر نشین مقتدرہ قومی زبان حکومتِ پاکستان اور ریکٹر انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

نادان دشمنوں کی حکمتِ عملی کو ناکام بنادیں گے جس طرح تحریکِ پاکستان کے زمانے میں ناکام بنایا تھا۔ گزشتہ 66 برس کے دوران ہم فقط تباہی اور بربادی کی راہوں پر ہی گامزن نہیں رہے۔ ہم نے ترقی و کامرانی کے راستوں پر بھی برق رفتاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان میں ایک دفاعِ وطن کی شاہراہ ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت افواجِ پاکستان جس بے سروسامانی کی حالت میں تھیں، اسے ذہن میں لائیں اور پھر دیکھیں کہ ہماری دفاعی استعداد اور ہماری ایٹمی صلاحیت دشمنوں سے زیادہ ''دوستوں'' کی نگاہوں میں کیونکر کھٹک رہی ہے؟ پوری دنیا میں کتنی ریاستوں کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر بھی نہیں گنی جاسکتی تو پھر پاکستان ناکام ریاست کیسے ہوئی؟ یہ افسانے تراشنے والے حقیقت کی ترجمانی نہیں کررہے۔

جسٹس ریٹائرڈ تنزیل الرحمان کا ایک خط اوائل مئی میں روزنامہ جنگ میں شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے دو غیرملکی زعماء کے مشاہدات سے پھوٹنے والے دو فقرے نقل کیے۔ پہلا فقرہ عالمی بینک کے صدر سے منقول تھا جنہوں نے پاکستان کے دورے کے بعد کہا تھا:

Pakistan has a death wish

یعنی پاکستان خواہشِ مرگ میں مبتلا ہے۔ دوسرا فقرہ امریکہ کے ایک صنعت کار کا تھا جو پاکستان میں سرمایہ کاری کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے آئے اور یہاں کی شخصیات اور یہاں کے امکانات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ:

Pakistani nation does not want
to make progress

یعنی پاکستانی قوم ترقی کرنا نہیں چاہتی۔

جسٹس ریٹائرڈ تنزیل الرحمان جو فیڈرل شریعت کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہ چکے ہیں، نے پاکستان میں برپا سارے فساد کی اصل جڑ دولت کی نامنصفانہ تقسیم کو ٹھہرایا، ان کا کہنا تھا:

پاکستان میں نہ معدنی ذخائر کم ہیں نہ معاشی وسائل، بلکہ ماہرین کا خیال ہے کہ ابھی تک پاکستان میں موجود معدنی اور دیگر قدرتی ذخائر کا عشرِ عشیر بھی تصرف میں نہیں آیا۔ اس لحاظ سے پاکستان قدرتی دولت اور وسائل سے مالا مال ملک ہے اور پاکستان کے مخالفوں کا یہ استدلال کہ پاکستان معاشی طور پر ایک مفلس اور محتاج ملک ہوگا، عملاً غلط ثابت ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مناسب منصوبہ بندی کے ساتھ اگر قومی وسائل اور افرادی قوت کا استعمال کیا جائے تو اس مملکتِ خداداد کی معیشت بہت جلد خودکفیل اور قابلِ رشک بنیادوں پر استوار ہوسکتی ہے چنانچہ سوال یہاں معاش یا دولت کی کمی کا نہیں، بلکہ اس کی غیرمنصفانہ تقسیم کا ہے۔

مغرب کی سیاسی، تہذیبی اور فکری غلامی بہت ہوچکی، اب گھر لوٹنا ہے۔ پاکستان کے کوچہ و بازار اور اپنے در و دیوار کے اندر بولی جانے والی والی زبانوں کو سیکھیے۔ جب آپ اپنی زبان سیکھ لیں گے تب آپ کو غیرملکی سرمائے سے چلنے والی غیرسرکاری تنظیموں سے تازہ خیالات مستعار لینے کی ضرورت پیش نہ آئے گی اور یہ حقیقت آپ پر آپ سے آپ روشن تر ہوجائے گی کہ این جی اوز اصل میں ایف جی اوز ہیں۔ یہ غیرسرکاری نہیں بلکہ غیرملکی تنظیمیں ہیں جو فارن گورنمنٹس انہیں کھلاتی پلاتی ہیں، یہ اُنہی کے گیت گاتی اور اُنہی کی بنائی ہوئی دھنوں پر رقص کرتی ہیں۔

ہمیں تھنک ٹینک کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا ہمارے لیے علامہ اقبالؒ کی فکر اور قائدِ اعظمؒ کا عمل کافی نہیں؟ ہم غیروں کو خوش کرنے کی خاطر نصف صدی سے اس فکر کو اپنی عملی زندگی کے قالب میں ڈھالنے سے غفلت کے مرتکب ہیں۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے پروانوں یعنی اسلامیانِ برِّصغیر کے خوابوں کا پاکستان عملاً وجود میں آسکے۔ اقبالؒ ہمیں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں

بنتے ہیں مِری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدّر کے ستارے کو تُو پہچان

ڈاکٹر صفدر محمود*

قائدِ اعظمؒ کیا چاہتے تھے؟

دانشوروں کا ایک منظّم گروہ گزشتہ چند برسوں سے دن رات یہ ڈھنڈورہ پیٹنے میں مصروف ہے کہ قائدِ اعظمؒ سیکولر ذہن کے مالک تھے اور وہ پاکستان میں سیکولر نظام نافذ کرنا چاہتے تھے۔ یہ حضرات قائدِ اعظمؒ کی گیارہ اگست 1947ء والی تقریر کو اپنا سیکولر ایجنڈا آگے بڑھانے کے لئے استعمال کرتے ہیں کیونکہ انہیں قائدِ اعظمؒ کی دیگر ہزاروں تقاریر میں کوئی ایسا مواد نہیں ملتا جسے وہ اپنی پراپیگنڈہ مہم کا ہراول دستہ بنا سکیں۔ قائدِ اعظمؒ نے تقسیمِ ہند سے قبل تقریباً 101 بار یہ اعلان کیا کہ پاکستان کے نظام کی بنیاد اسلامی اصولوں پر اٹھائی جائے گی اور قیامِ پاکستان کے بعد چودہ بار یہ واضح کیا کہ پاکستان کے نظام، آئین اور ملکی ڈھانچے کو اسلامی اصولوں پر استوار کیا جائے گا۔ اُنہوں نے لاتعداد بار کہا کہ قرآن ہمارا راہنما ہے اور ہمیں قرآن ہی سے راہنمائی کی روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ ان سینکڑوں اعلانات اور وعدوں کے باوجود سیکولر حضرات اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور ذہن کے دریچے کسی اخلاقی بات پر کھولنے کے لئے تیار نہیں۔

میں خلوصِ نیت سے سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے نظام کا فیصلہ پاکستان کے عوام نے کرنا ہے جنہوں نے پاکستان کے قیام کا فیصلہ کیا تھا، اس لئے اگر مجھے قائدِ اعظمؒ کی تقریروں سے کہیں بھی سیکولرازم (لادینیت) کی بُو آتی تو میں اِسے نہ صرف تسلیم کرتا بلکہ کُھلے ذہن سے اس کا اظہار کرتا، کیونکہ میرے نزدیک قائدِ اعظمؒ سے عقیدت اور فکری دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ بابائے قوم کے فرمودات کو کُھلے ذہن اور تعصب سے پاک دل کے ساتھ پڑھا جائے۔ گیارہ اگست کو دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب ہونے کے بعد قائدِ اعظمؒ کی تقریر فی البدیہہ تھی اور اس میں انہوں نے باقی باتوں کے علاوہ جس طرح مذہبی اقلیتوں کو برابری کے درجے کا وعدہ کیا اور مذہبی آزادی کا پیغام دیا، وہ دراصل میثاقِ مدینہ کی روح کے مطابق ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے مذہبی اقلیتوں سے کیا تھا اور انہیں برابر کے شہری حقوق دیے تھے۔ جو حضرات پاکستان کی پہلی کابینہ میں چودھری ظفر اللہ خان (قادیانی) اور جوگندر ناتھ منڈل (ہندو) کو وزارتیں دینے پر اعتراض کرتے ہیں، اُن سے گزارش ہے کہ وہ میثاقِ مدینہ کا مطالعہ کریں۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ قائدِ اعظمؒ ہرگز نہ تو مذہبی شخصیت تھے اور نہ ہی تھیوکریسی (پاپائیت) کے حامی۔ تھیوکریسی کا تصور تک اسلام میں موجود نہیں ہے۔ اُن کا تصورِ پاکستان ایک اسلامی، فلاحی اور جمہوری ریاست کا تھا جس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر ہو یعنی جس میں نہ صرف غیر اسلامی قوانین، اور رسومات کو ختم کر دیا جائے بلکہ اس کے آئین، قانون اور ڈھانچے کی بنیاد بھی اسلامی اصولوں کی روح کی عکاسی کرے۔ معمولی سوجھ بوجھ کی بات ہے کہ جس ملک کی بہت بڑی اکثریت مسلمان ہو وہاں غیر اسلامی قوانین کیسے بن سکتے ہیں۔ اسلام کی روح کے عین مطابق قائدِ اعظمؒ مذہبی فرقہ واریت اور مذہبی تشدد کے خلاف

* ممتاز محقق، قومی اور بین الاقوامی امور پر متعدد بلند پایہ کتب کے مصنف

تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں اسلام کی رُوح کے عین مطابق قانون کی حکمرانی، معاشی انصاف، انسانی برابری، اور سماجی مساوات کو یقینی بنایا جائے۔ اگر قائدِ اعظمؒ زندہ رہتے تو ایسا ہی ہوتا لیکن پاکستان میں ان اصولوں کا نفاذ نظر نہیں آتا تو کیا یہ تصورِ پاکستان کا قصور ہے؟ تصورِ پاکستان تو ایک آئیڈیل ہے جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ابھی مزید جدّ وجُہد کی ضرورت ہے۔ اسی لئے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ منزل کا شعور زندہ رہنا چاہیئے یہ آرزو باقی رہے تو کبھی نہ کبھی منزل مِل ہی جاتی ہے۔ قائدِ اعظمؒ قانون کی حکمرانی، معاشی عدل اور انسانی مساوات کے ساتھ ساتھ جاگیرداری نظام کا بھی خاتمہ چاہتے تھے، وہ ہر قسم کی کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتے تھے، مگر موجودہ صورتِ حال نے مایوسی کے اندھیرے پھیلا دیئے ہیں، نوجوان نسلوں کو قیامِ پاکستان کے حوالے سے غیر یقینی میں مبتلا کرنے کا کاروبار زوروں پر ہے۔ اس فضا میں قائدِ اعظمؒ کے تصورِ پاکستان کی شمع جلائے رکھنا ضروری ہے تاکہ نوجوان نسلوں کے سامنے ایک آئیڈیل موجود رہے اور وہ اسلام دشمن اور قائدِ اعظمؒ مخالف لابی کے پراپیگنڈے کا شکار نہ ہوں۔

سیکولر حضرات مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا پرچار کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ریاست اور چرچ کی علیحدگی کا تصور بنیادی طور پر عیسائیت کا تصور ہے کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں بقول اقبالؒ:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اُن کا یہ الزام کہ فرقہ واریت اور دہشت گردی سیاست کو مذہب سے ملانے کا نتیجہ ہے، سراسر بے بنیاد ہے۔ اسلام بذاتِ خود فرقہ واریت، دہشت گردی اور انتہا پسندی کی مذمت کرتا ہے۔ دراصل یہ سب کچھ ہماری بے بصیرت پالیسیوں اور عالمی قوتوں کی چالوں کا نتیجہ ہے جس میں پاکستانی عوام پھنس کر رہ گئے ہیں۔

ایک ریسرچ سکالر کے بقول قائدِ اعظمؒ نے قیام پاکستان سے قبل تقریباً 101 بار یہ اعلان کیا کہ نئی مملکت کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر استوار کی جائیں گی۔ یوں تو اُن کی سینکڑوں تقریریں اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں لیکن آپ کو اس کی ایک چھوٹی سی جھلک دکھانے کے لئے مَیں قائداعظمؒ کے خط بنام پیر مانکی شریف آف صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخوا) سے چند سطریں پیش کر رہا ہوں کیونکہ اس خط کا ذکر قائدِ اعظمؒ کی تقاریر اور اکثر کتابوں میں نہیں ملتا اور نہ ہی لوگ عام طور پر اس سے آگاہ ہیں۔ یاد رہے کہ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان بے پناہ سیاسی اثر رکھتے تھے اور اُنہیں کانگرس کے ایک ستون کی حیثیت حاصل تھی۔ اُن کا صحیح معنوں میں توڑ پیر آف مانکی شریف تھے، مسلم لیگ کے لئے جن کی حمایت سیاسی پانسہ پلٹ سکتی تھی۔ 1945ء میں پیر صاحب نے مسلم لیگ میں شمولیت سے قبل قائدِ اعظمؒ سے تصورِ پاکستان کے حوالے سے وضاحت چاہی تو قائدِ اعظمؒ نے پیر صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اُنہوں نے وضاحت کی کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کبھی شریعت کے منافی قوانین نہیں بنائے گی اور نہ ہی پاکستان کے مسلمان غیر اسلامی قوانین کی اجازت دیں گے۔

(دستور ساز اسمبلی کی کارروائی، 9 مارچ 1949ء، جلد 4، نمبر 3، صفحہ 46)

آج یہ تصور کرنا بھی محال ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد نوزائیدہ مملکت کو مسائل کے کس کوہِ ہمالیہ کا سامنا تھا۔ لاکھوں مہاجرین کی آبادکاری، خالی خزانہ، وسائل کا فقدان اور نئی مملکت کے لئے انتظامی ڈھانچے اور مرکزی حکومت کا قیام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دوسری طرف قائدِ اعظمؒ کی صحت دن بدن گر رہی تھی اور کئی دہائیوں کی مسلسل محنت نے اُنہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا تھا، چنانچہ قیامِ پاکستان کے ایک برس بعد وہ گیارہ ستمبر 1948ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔

قائدِاعظمؒ زندہ رہتے تو کس طرح اپنے وعدے شرمندۂ تعبیر کرتے اور کس طرح نئی مملکت کی تعمیر کرتے' اس کا اندازہ اُن کے دستور ساز اسمبلی کے 14 اگست 1947ء کے خطاب سے ہوتا ہے جس میں اُنہوں نے نبی کریمؐ کو اپنا رول ماڈل قرار دیا اور 1948ء کے امریکی عوام کے نام پیغام سے بھی ہوتا ہے جس میں انہوں نے واضح کیا کہ پاکستان کا دستور جمہوری طرز کا ہوگا جس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ اس ارادے کی ایک معمولی سی جھلک جنرل محمد اکبر خان (رنگروٹ) کی کتاب ''میری آخری منزل'' کے صفحہ نمبر 281 میں ملتی ہے جو بہت سے لوگوں کے لئے حیرت کا باعث ہوگی۔ جنرل محمد اکبر (پی اے نمبر 1) کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ 25 جون 1948ء سے تین دن کے لئے زیارت میں علیل قائدِاعظمؒ کے مہمان رہے۔ قائدِاعظمؒ سے ملاقات میں جنرل اکبر نے فوجی میسوں میں انگریز حکومت کی شروع کی گئی شراب نوشی کو ختم کرنے کی تجویز دی جس کے جواب میں ''قائدِاعظمؒ نے اپنے اے ڈی سی کو بلایا اور کانفیڈنشل باکس لانے کو کہا۔ قائدِاعظمؒ نے جیب سے چابی نکالی اور باکس کو کھول کر مراکشی چمڑے سے جلد بند ایک کتاب نکالی' انہوں نے اُسے اُس مقام سے کھولا جہاں نشانی رکھی ہوئی تھی اور فرمایا جنرل! یہ قرآن مجید ہے اس میں لکھا ہے کہ شراب و منشیات حرام ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ایک حکم جاری کریں اور افسروں کو متنبہ کریں کہ شراب حرام اور منع ہے۔ قائدِاعظمؒ مسکرائے اور فرمایا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ قائدِاعظمؒ کا حکم قرآن مجید کے احکامات سے زیادہ موثر ہوگا' سٹینو کو بلایا گیا' قائدِاعظمؒ نے ایک مسوّدہ تیار کیا اس میں قرآنی آیات کی جانب توجہ دلا کر فرمایا کہ شراب و منشیات حرام ہیں۔ میں نے اس مسوّدے کی نقل لگا کر شراب نوشی بند کرنے کا حکم جاری کر دیا جس پر میری ریٹائرمنٹ تک عمل ہوتا رہا۔ قائدِاعظمؒ کا نفیڈنشل باکس ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے اور اس باکس میں قرآن مجید کا نسخہ بھی شامل تھا....''

جنرل اکبر کی عینی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ قائدِاعظمؒ قرآن مجید پڑھتے اور ضروری مقامات پر نشانیاں بھی رکھتے تھے۔ اسی طرح 15 اگست 1947ء کو پاکستان کا جھنڈا لہرانے کے لئے قائدِاعظمؒ کا مولانا شبیر عثمانیؒ کو کہنا بھی ایک واضح اشارہ ہے اس لئے اگر اُنہیں موقع ملتا تو وہ یقیناً اسلامی اصولوں کے نفاذ کے لئے اقدامات کرتے اور تصورِ پاکستان کو عملی جامہ پہناتے لیکن بدقسمتی سے وہ قیامِ پاکستان کے محض ایک سال بعد رحلت فرما گئے۔ تکمیلِ پاکستان کی جدّ وجُہد ادھوری رہ گئی اور پھر ملک پر وہ طبقے اور گروہ چھا گئے جنہوں نے پاکستان کو پاکستان نہ بننے دیا۔ اب ہمیں مِل جل کر پاکستان کو پاکستان بنانا ہے اور قائدِاعظمؒ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا ہے۔

دُعا

ؐ خُدا کرے مِرے پیارے نبیؐ کے صدقے میں
مِرے وطن کا یہ پَرچَم سَدا بلندر ہے
کبھی نہ اس کے تقدس پہ کوئی آنچ آئے
ہر ایک شخص حمیّت پہ کاربند رہے

ہر ایک غنچۂ شاداب لہلائے سَدا
اس آرزو سے مزین صَدا نکلتی ہے
کبھی زوال کی صورت نہ کوئی پَیدا ہو
بصدقِ دِل یہی ہر دَم دُعا نکلتی ہے

——— یوسف شیدائی

ممتاز اقبال ملک*

اٹّل تقاضا

اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان' نہایت رحم کرنے والا ہے۔

(اے حبیب) آپ کہہ دیں کہ اے کافرو! مَیں اُس کی عبادت نہیں کروں گا جس کی عبادت تم کرتے ہو اور نہ تم عبادت کرتے ہو اُس کی جس کی مَیں عبادت کرتا ہوں اور نہ مَیں اُن کی عبادت کرنے والا ہُوں جن کی تم نے عبادت کی اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی مَیں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لئے۔

محترم ڈاکٹر نور احمد شیخؒ نے ان آیاتِ مبارکہ کے مفہوم کو شعری قالب میں یوں ڈھالا:

ابتدا کرتا ہُوں نامِ پاک سے اللہ کے ذات ہے جس داورِ حق کی عظیم
جو بڑا ہی مہرباں ہے ' ہے جو رحمان و رحیم

سُنا دیں کافروں کو اے پیمبر صاف صاف اِک بار
عبادت جس کی تم کرتے ہو' وہ میرا نہیں معبُود!
نہیں منظور تم کو ہے جو میرا قبلۂ مقصُود
مزید اب حُجّت و تکرار ہے اس ضمن میں بے سُود
تمہارا آقا و معبُود میرا ہو نہیں سکتا
مِرا معبُودِ حق تم کو گوارا ہو نہیں سکتا
تمہارا راستہ ہے اور ' میرا راستہ کچھ اور
اُصولوں میں کسی سے کوئی سودا ہو نہیں سکتا

یہ دوقومی نظریے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے جو چودہ سو سال پہلے قرآن مجید کی سورۃ الکافرون میں صادر ہُوا!

دوقومی نظریے کی بنیاد پر برِّصغیر میں مسلمانوں کے الگ وطن' پاکستان کا قیام اسی قرآنی فیصلے پر عمل درآمد کا نمونہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں برِّصغیر کے مسلمانوں نے قیامِ پاکستان کے لیے مشترکہ اور متحدہ طور پر جِدّ وجُہد کر کے اپنا دینی فرض ادا کیا۔ پاکستان کے قیام کے اثرات عالمگیر سطح پر بھی مرتب ہوئے اور عالمِ اسلام پر بھی۔ اس طرح ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کے احیا کے امکانات روشن تر ہوئے اور اسی امکان نے پاکستان کے مملکتی وجود کو ان عالمی قوتوں کے لئے ایک بڑے سوالیہ نشان کی صورت دے دی جو پہلی جنگِ عظیم (1914-1918) میں فتح مند ہونے کے بعد مسلمانوں کی مرکزیت یعنی سلطنتِ عثمانیہ کو منتشر کرنے کے بعد مطمئن ہوگئی تھیں کہ وہ اپنے اصل حریف (اسلام اور مسلمان) کو بالکل بے دست و پا کر چکی ہیں۔ پاکستان کا قیام برِّصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کی علامت ہی نہیں تھا بلکہ اپنی نظریاتی بنیادوں کی وجہ سے پاکستان ان عالمی قوتوں کے لئے خصوصی تشویش اور خوف کا باعث بنا جو مسلمانوں کو عالمگیر سطح پر پوری طرح بااختیار اور آزاد دیکھنے پر آمادہ نہیں تھیں—اور اب بھی نہیں ہیں۔

دوقومی نظریے کے خوفزدگان میں پاکستان کا پڑوسی ملک بھارت سرِفہرست ہے' جس سے اسی دوقومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم اور قیامِ پاکستان کا غم ابھی تک بُھلایا نہیں جا سکا۔

* سابق ایڈیٹر ہلال' پاکستان آرمی جرنل / بانی ایڈیٹر: ''دی نسٹیئن''۔ اب کنسلٹنٹ نسٹ پبلشنگ

نظریاتی حوالے سے پاکستان کے قیام کی جِدّ وجُہد نہ صرف درست تھی بلکہ برِّصغیر کے مسلمانوں کے فکری، علمی اور تہذیبی شعور کا ناگریز تقاضا تھا کہ ان کو قرآن وسنت کی روشنی میں ایک اہم سماجی تجربے کے لئے سازگار فضا میّسر آئے۔ دوقومی نظریے کا اعلان کسی تعصب کا اظہار نہیں تھا بلکہ اس شعور کی بیداری کا نتیجہ تھا جو توحید پر ایمان کے سماجی مضمرات کے اِدراک سے پیدا ہوتا ہے۔

تعلیماتِ اسلامی کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ انسانی رجحانات کی نفی نہیں کرتیں، بلکہ ان رجحانات کی توانائی کو تعمیری سمت عطا کرتی ہیں۔ اسلام خاندان، قبیلہ، قومیت یا قوم یا ان جیسے دوسرے الفاظ، جو انسانی تاریخ میں اصطلاحات کی صورت اختیار کر گئے ہیں، کی مکمل نفی نہیں کرتا، بلکہ تشریح اور وضاحت کرتا ہے۔ قوم نسبتاً ایک بڑا گروہ، قومیت نسبتاً ایک چھوٹا گروہ یعنی کسی خصوصیت یا امتیاز کی بنا پر یکجا ہو جانے والے لوگ۔ ہاں اس نیرنگی کے نتیجے میں تخریبی انداز کی جو عصبیّت انسان میں بیدار ہوتی ہے، اس عصبیت کو انسانی معاشرے کے لئے ضرر رساں قرار دے کر اس سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

''قوم اور وطنیت'' کے زیرِ عنوان علامہ اقبالؒ کا ایک مدلّل مضمون 2 مارچ 1938ء کو ہندوستان کے تقریباً تمام اخبارات میں شائع ہُوا۔ اس مضمون میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> . . . اگر وطنیت وقومیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض رشتہ داروں اور ہم نسل اور ہم قوم عناصر کو آپؐ سے دشمنی کیوں ہوئی؟ رسولِ کریمؐ نے کیوں نہ اسلام کو محض ایک ہمہ گیر معمولی مِلّت سمجھ کر بلحاظِ قوم یا قومیّت ابوجَہل اور ابولَہب کے ساتھ تعلق قائم رکھا، کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیّتِ وطنی قائم رکھی؟ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریشِ مکّہ کا بھی تھا، مگر گمراہ عناصر اس نکتے پر غور نہیں کرتے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک اسلام کو امتِ مسلمہ کی آزادی مقصود تھی۔ ان کو چھوڑ کر یا ان کو کسی دوسری ہیئتِ اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابوجَہل اور ابولَہب امّتِ مسلمہ کو آزادی سے پُھولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یوں ان سے تنازعہ پیدا ہُوا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم آپؐ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد تھی، لیکن حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امّت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایۂ رحمت میں آ کر مسلمان ہو گئے، خواہ آپؐ کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب امّتِ مسلمہ یا مِلّت محمدیہؐ بن گئے۔ پہلے وہ ملک ونسب کے گرفتار تھے، اب ملک اور نسب ان کا گرفتار ہو گیا:

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را
نداند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بُودے محمدؐ
ندادے دعوتِ دیں بُولَہب را

[حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپؐ ابولَہب، ابوجَہل یا کفارِ مکّہ سے فرماتے کہ تم اپنی بُت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں]

مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر حضورؐ پاک (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن پرست کی راہ ہوتی، لیکن نبی آخر الزماںؐ کی راہ نہ ہوتی۔ نبوتِ محمدیہؐ کا مقصد و غایت یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ قائم کی جائے، جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی (اسلام) کے تابع ہو جو نبوّتِ محمدیہؐ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا یا بنی نوعِ انسان کی اقوام کو قبائل اور زبان و نسل کے اختلافات تسلیم کر لینے کے باوجود انہیں تمام آلودگیوں سے پاک صاف کیا جائے جو زماں، مکاں، وطن، قوم، نسل، نسب اور ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اِس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیّل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدیؐ، اور یہی ہے نصب العین ملّتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں پر پہنچنے تک معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالَم کی باہمی مغائرت دُور کرنے میں اور قبائلی، نسلی اور لسانی امتیازات کے باوجود ان کو یک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے، وہ دیگر مذاہب سے تین ہزار سال میں بھی نہ ہو سکا . . . .

[محمد طاہر فاروقی: سیرتِ اقبال، ص 450-451]

ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بہ حیثیت مسلمان ہمارا جسمانی وطن زمین ہے یا زمینی رشتہ ہے اور ہمارا انسانی وطن ہمارا دین ہے جو ہمیں انسانی سطح کی زندگی کے لیے ہدایت فراہم کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ

> پاکستان کے قیام کے مطالبے کی بنیاد کے طور پر برِّصغیر کے مسلمانوں کی جانب سے یہ اعلان ضروری تھا کہ ان کا تشخص اور ان کی اجتماعی پہچان وطنی قومیت نہیں، بلکہ دینی رشتہ ہے۔ برِّصغیر کے مسلمانوں نے ردّ تو اس بات کو کیا تھا اور اب بھی کرتے ہیں کہ برِّصغیر میں صرف ایک قوم یعنی ہندوستانی قوم آباد نہیں۔ ان کا موقف تھا اور ہے کہ برِّصغیر میں دو بڑی قومیں آباد ہیں: ایک ہندو قوم ہے اور دوسرے مسلمان ہیں۔ دونوں ہر انداز میں اپنا جُداگانہ تشخص رکھتی ہیں اس لئے وہ ایک الگ قوم ہیں۔ یہ بنیاد تھی اس تصور کے اظہار اور اعلان کی جسے دوقومی نظریہ کہا جاتا ہے۔ کوئی مسلمان دوقومی نظریے کو مسترد کرنا تو کُجا ایسا سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کیونکہ دوقومی نظریہ اسلام کا اٹل تقاضا ہے۔ [زیڈ اے سلیری: دوقومی نظریہ]

نے اپنے خطبے ''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' میں اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

> . . . اسلام کی حقیقت ہمارے لیے صرف یہی نہیں کہ وہ ایک دین ہے، بلکہ اسلام ہمارے لیے اس سے بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چُھپا ہوا ہے اور اپنی قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ اسلامی تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، ویسی ہی نسبت اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں بھی اسلامی اصول یا مقدس روایات کے حوالے سے اللہ کی رسّی ہمارے ہاتھوں سے

چھوٹی، ہماری جماعت یا ملت کا شیرازہ بکھر گیا. . . .

اس خطبے میں علامہؒ نے یہ بھی کہا کہ مسلمان اور دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قوم کا اسلامی تصور دوسری اقوام سے بالکل مختلف ہے۔ نہ اشتراکِ وطن، نہ اقتصادی مفادات کا اشتراک، بلکہ ہم لوگ اس برادری میں، جو حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم فرمائی تھی، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات سے متعلق ہم سب کے اعتقاد کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات اس حوالے سے ہم تک پہنچی ہیں، وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔

برّصغیر کے مسلمانوں کی جانب سے اپنے قومی تشخص کے اعلان اور اس (دوقومی نظریے) کی بنیاد پر اپنے لیے ایک آزاد اور خودمختار مملکت کے مطالبے کا تاریخی پس منظر صدیوں پر محیط ہے اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ سے دورِ حاضر کے صاحبانِ فکر و نظر تک ہمارے لئے قابلِ فخر اور قابلِ احترام نظریاتی راہنمائی کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان کے سارے روشن افکار و نظریات کی نہایت مؤثر یکجائی ہمیں علامہ اقبالؒ کے فکر و فن میں اور ان کے خطبات میں میّسر آجاتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو علامہ اقبالؒ کا آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر 1930ء کا خطبۂ صدارت خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے قومی تشخص (دوقومی نظریہ) کو دینِ اسلام کے بنیادی تقاضے کی صورت میں اس مؤثر انداز میں پیش کیا کہ وہ برّصغیر کے مسلمانوں کی خودشناسی کے سفر کا نقطۂ آغاز بن گیا۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے خطبۂ الہ آباد کے چند اہم اقتباسات سامنے لانا ضروری ہیں جن میں ماہ و سال کی طویل گردش اور خود ہمارے ملک میں بہت واضح نظریاتی انتشار کے باوجود، آج بھی سچائی کی توانائی اور کشش موجود ہے۔ اس خطبے میں علامہ اقبالؒ نے کہا:

> . . . اسلام ہی وہ سب سے اہم جزوِ ترکیبی تھا جس سے برّصغیر کے مسلمانوں کی تاریخِ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام کی بدولت مسلمانوں کے سینے اُن جذبات و انوار سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے اور جن سے متفرق اور منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک الگ اور متعین قوم کی صورت اختیار کر لیتے اور ان میں ایک خاص اخلاقی شعور بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں آج (1930ء میں) صرف ہندوستان ہی وہ واحد علاقہ ہے جہاں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہُوا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کا اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین اور اداروں کی احسان مند ہے جو اسلامی تہذیب سے وابستہ ہیں . . . .

علامہ اقبالؒ نے مزید وضاحت کی: ''اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے، جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو دوسرے کا ترک بھی لازم آجائے گا اور مَیں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کے لئے تیار ہوگا جس کا وطنی یا قومی اصول اسلام کے اصولِ اتحاد کی نفی پر مبنی ہو۔''

علامہ اقبالؒ نے یہ بات 1930ء میں کہی تھی۔ غور کیجئے کہ کیا پاکستان کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر ان افکار پر دوبارہ پوری سنجیدگی سے غور

کرنے اور ان سے روشنی حاصل کرنے کی شدید ضرورت نہیں ہے؟ اس خطبے کے دو مزید اقتباسات پیش کرنا ضروری ہے جن میں پاکستان کے وجود کی غرض و غایت پر روشنی پڑتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا:

. . . آج (1930ء میں) برطانوی ہند دنیا میں سب سے بڑی مسلم آبادی کا ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اس ملک (یا اس خطۂ ارض) میں زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے ایک علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے . . . .

گویا قیامِ پاکستان کا اصل مقصد محض حصولِ اقتدار اور حکومت کا قیام نہیں تھا' بلکہ اس کو ایک بلند تر مقصد کے حصول کے لئے قائم ہونا تھا اور وہ مقصد تھا کہ برِّصغیر میں اسلام ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے زندہ رہے اور اسلامی تمّدن کا تحفظ۔

توحید پر ایمان کے سماجی مضمرات پیشِ نظر رہیں' تو علامہ اقبالؒ کے الہ آباد کے خطبے میں کہی گئی اس بات کی گہری معنویت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے قیام کی کوشش کوئی اختیاری معاملہ نہیں۔ یعنی یہ مسئلہ کہ جہاں بھی ممکن ہو سکے' مسلمان اسی انداز کی مملکت کے قیام کے لئے جدِ وجُہد کریں' یہ ہمارے لئے پسند یا ناپسند کا یا اختیاری معاملہ نہیں بلکہ یہ جدّ وجُہد ہم پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک فرض کے طور پر عاید ہوتی ہے (سورۃ الکافرون) اور اس فرض کی تکمیل ہماری انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔

دوقومی نظریے کی یہی بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر دوقومی نظریے کا اعلان ناگزیر تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے 8 مارچ 1944ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور

> پاکستان کا قیام برِّصغیر کے مسلمانوں کی اس آرزو کا ثمر ہے کہ وہ اپنی سماجی زندگی کو اسلامی تعلیمات اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم آہنگ کرنے کا عہد کر رہے تھے۔ پاکستان اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے اسی عہد کا انعام ہی تو ہے۔ حصولِ پاکستان کی جدِ وجُہد بے مثال ہے۔ اگر پاکستان قائم نہ ہوتا' تو بھی متحدہ برِّصغیر میں مسلمان اپنے سیاسی' اقتصادی اور سماجی حقوق کچھ نہ کچھ تو ضرور حاصل کر لیتے لیکن اسلامی نظم کے قیام کے تجربے کا کوئی امکان نمایاں نہ ہوتا۔ ہمارا اصل مقصد یہ تھا کہ قیامِ پاکستان کے وسیلے سے اپنے لئے ایک باعزت اور بامقصد زندگی گزارنے کی راہیں ہموار کریں۔ اقتصادی' فنی اور دیگر ذیلی ترقیاں تو اس اعلیٰ مقصد کی راہ میں خود بخود منزل بہ منزل حاصل ہوتی چلی جائیں گی۔
>
> [پروفیسر حسنین کاظمی: تحریکِ پاکستان]

طالبات سے خطاب کرتے ہوئے مطالبۂ پاکستان کے سلسلے میں کہا تھا:

. . . آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کی ایک الگ مملکت کی وجۂ جواز کیا تھی؟ تقسیمِ ہند کے مطالبے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی اصل وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے' نہ انگریزوں کی چال۔ درحقیقت برِّصغیر میں مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کا قیام خود اسلام کا ایک بنیادی مطالبہ ہے. . . .

برِّصغیر کے مسلمانوں کے قومی وطن کی حیثیت سے ایک آزاد اور خودمختار مملکت کے قیام کو علامہ اقبالؒ نے محض ایک خطۂ زمین پر حکومت کے بکھیڑے پھیلانے کے لئے پیش نہیں کیا تھا۔ ان کے پیشِ نظر مقصد بہت زیادہ بلند تھا اور یہ مقصد بھی خود علامہؒ کے ذہن کا گھڑا ہوا نہیں تھا بلکہ

ارشاداتِ قرآنی اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گہرے مطالعے کا نتیجہ تھا۔اس مملکت کے قیام کا مقصد انہوں نے خود اسی خطبۂ الہ آباد میں یوں بیان کیا:

> . . . مَیں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے اعتبار سے ایک منظّم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں' اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن' شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے. . . .

یہ تھا اصل مقصد پاکستان کے قیام کا۔

ان معروضات کے آغاز میں دوقومی نظریے کے خوفزدگان کا ذکر ہُوا۔ ہر قیمت پر دوستی کی التجا کے باوجود اس کا ثبوت بھارت سے اس بھاشن کی صورت میں ملا:

''کشمیر پر پاکستان کا دعویٰ دوقومی نظریہ کی بنیاد تھا جسے برّصغیر کے مسلمان سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں رّد کر چکے' پھر بھی پاکستان بھارت کے اٹوٹ انگ کشمیر پر دعویٰ رکھتا ہے۔'' معلوم نہیں یہ خوش فہمی کیسے لاحق ہوگئی کہ خدانخواستہ برّصغیر میں دوقومی نظریہ کو مسلمانوں نے ردّ کر دیا۔ پاکستان سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی بھارتی فوجی جارحیت کے نتیجے میں عمل میں آئی نہ کہ عوامی ریفرنڈم کے ذریعے۔ بنگلہ دیش کے عوام کی بھاری اکثریت کا اپنے الگ وجود پر اصرار دوقومی نظریے کی کامیابی کا زندہ ثبوت ہے جس کا اقرار بھارتی قیادت کرے نہ کرے' لیکن زمینی حقائق یہی ہیں۔ تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنے کے لیے یہاں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے راہنما سبھاش چندر بوس کی پوتی ڈاکٹر شرمیلا بوس کی ریسرچ کا حوالہ نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ ڈاکٹر شرمیلا بوس یونیورسٹی آف آکسفورڈ کے شعبہ سیاسیات و بین الاقوامی تعلقات کی سینئر ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں۔

"Dead Reckoning Memories of 1971 Bangladesh War" کے نام سے ان کی کتاب نے پاکستان دُشمن محققین اور دانش وروں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر شرمیلا چندر بوس کی گواہی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اوّل وہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے راہنما سبھاش چندر بوس کی پوتی ہیں' دوم وہ بنگالی ہیں اور سوم یہ کہ ہندو بھی ہیں۔ یہ کتاب شائع ہوتے ہی پاکستان دُشمنوں نے شرمیلا بوس کو بنگال دشمن اور پاکستانی ایجنٹ کے القابات سے داغدار کرنا شروع کر دیا۔ شرمیلا کی تحقیق کے مطابق . . . . بنگلہ دیش کے حوالے سے بھارتی انٹیلی جنس را اور بھارتی میڈیا کا پروپیگنڈا بالکل یک طرفہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس قتل و غارت گری کے پسِ پردہ صرف اور صرف بھارتی حکومت کی چالبازی تھی جس نے مکتی باہنی کے نام سے جرائم پیشہ اور ورغلائے گئے بنگالی مسلمانوں کی ایسی فوج تیار کی' جس نے را کے منصوبے کے مطابق پاکستانی فوج کے خلاف اشتعال انگیز کارروائیاں کیں۔ غیر بنگالی پاکستانیوں کا قتلِ عام کر کے پاکستانی فوج کو جوابی کارروائی پر مجبور کیا . . . .'' ڈاکٹر شرمیلا بوس نے ثابت کیا کہ پاکستانی فوجیوں کی طرف سے بنگالی عورتوں کی بے حرمتی

کے واقعات بڑھا چڑھا کر افسانوی انداز میں پیش کیے گئے۔ انہوں نے لکھا . . . ''بنگالی قوم پرست شدید نوعیت کے انسانیت سوز جرائم میں ملوث تھے۔ ذرائع ابلاغ کی یہ اطلاعات درست نہیں جن میں کہا گیا کہ پاکستانی فوج نے تیس لاکھ بنگالیوں کو قتل کیا۔ یہ محض من گھڑت افسانہ ہے کیونکہ اتنی بڑی ہلاکتیں کسی سطح پر بھی ثابت نہیں کی جاسکیں۔ حتیٰ کہ کسی سرکاری رپورٹ میں بھی اس تعداد کا ثبوت یا حوالہ تک موجود نہیں . . . .''

ڈاکٹر شرمیلا لکھتی ہیں کہ سابق مشرقی پاکستان میں 1971ء کی خانہ جنگی کی داستان فاتح فریق یعنی بنگالی قوم پرستوں کی طرف سے بیان کی گئی ہے۔ اس نے نام نہاد مظالم کا جھوٹا پروپیگنڈا کر کے ساری دنیا کو طویل عرصے تک اُلّو بنائے رکھا۔ بنگالی قوم پرستوں کی بغاوت غیر بنگالیوں کے خلاف ناقابلِ برداشت تشدد میں تبدیل ہوگئی۔ مغربی پاکستان کے شہریوں اور ان میں بھی زیادہ تر اُردو بولنے والوں کو نشانہ بنایا گیا' جو تقسیمِ ہند کے وقت بھارت سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آئے تھے' جنہیں بہاری کہا جاتا تھا۔ بنگالی قوم پرستی کے نام پر ہونے والے نسلی تشدد میں غیر بنگالی مرد ' عورتوں اور بچوں کی ہلاکتیں جنگ کے دوران اور اس کے دس ماہ بعد تک ہوتی رہیں۔ قتلِ عام کا شکار ہونے والے غیر بنگالیوں کو سیکڑوں اور بعض واقعات میں ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا گیا۔ قتلِ عام میں کوئی تخصیص نہ رکھی گئی' نہتے لوگوں کو انتہائی حیوانیت کے ساتھ قتل کیا گیا۔ بدترین مظالم تو بنگالی علیحدگی پسندوں نے اپنے ہی لوگوں پر ڈھائے تھے۔ آخری دنوں میں حکومت کے حامیوں کی ہلاکتیں بھی بدترین جرم تھا . . . .''

اس گواہی کے بعد کون عقل مند سقوطِ ڈھاکہ کو دوقومی نظریہ ردّ ہونے کا نام دے سکتا ہے؟ اب 42 سال بعد نام نہاد جنگی مقدمات کے ڈرامے کو

> دوقومی نظریے کا اعلان بجائے خود کوئی مقصد نہیں تھا' بلکہ ایک بڑے مقصد یعنی پاکستان کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھا اور پاکستان کا حصول بھی بجائے خود کوئی مقصد نہیں تھا بلکہ اس مملکت کو دورِ حاضر میں اطلاقی اسلام کے لئے ایک تجربہ گاہ کی حیثیت حاصل ہونا تھی۔ گویا دوقومی نظریے کا اعلان قیامِ پاکستان کی جانب پہلا قدم اور قیامِ پاکستان کا اصل مقصد اس مملکت میں دورِ حاضر کے تقاضے پیشِ نظر رکھ کر قرآن مجید اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتسابِ نُور کرتے ہوئے ایک آزاد اور خودمختار مملکت کی تنظیم اور تشکیل تھا۔ [ڈاکٹر منیر الدین چغتائی: نظریۂ پاکستان]

عدالت کا نام دے کر متحدہ پاکستان کے حامیوں کو پھانسی کی سزائیں دی جا رہی ہیں کہ انہوں نے وفاقِ پاکستان کے دفاع کے لیے پاکستانی افواج کا ساتھ کیوں دیا تھا۔ حالانکہ ملکی و بین الاقوامی قانون' اخلاقی اور دنیا کے مسلمہ اصولوں کے تحت وطنِ عزیز کو متحد رکھنے کے لیے پاکستان کی افواج کا ساتھ دینا اُن کا فرض اور حبّ الوطنی کا تقاضا تھا۔ 1971ء کی جارحیت کو بھلانے کی دانستہ یا نادانستہ جتنی بھی کوشش کریں' وہ بھولنے یا بھلائے جانے والا باب نہیں۔ اسے نظرانداز کریں تو بھارت موقع ملتے ہی اسے یاد کرانے کا اہتمام کرتا ہے۔ بنگلہ دیش میں نئی کربلا برِّصغیر میں مسلمانوں کے تحفظ اور دفاع کا معاملہ ہے' انصاف اور انسانیت کا معاملہ ہے۔ ہر پاکستانی پرانی بات کو بُھلا کر بنگلہ دیش کی آزادی' خودمختاری اور سالمیت کو اُمتِ مسلمہ کی تقویت کا باعث سمجھتا ہے' مگر بنگلہ دیش کے اقتدارِ اعلیٰ کو خطرے اور انتشار میں دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انجام بہرحال تباہ کُن ہوگا۔ کیا اسی کا نام ہے دوقومی نظریے کا ناکام ہوجانا؟

بھارت میں بسنے والے مسلمانوں نے بھی 1947ء کے بعد آج 66 سال تک ہندو مذہب، کلچر، روایات اور دوسری تمدنی اقدار کے خلاف اپنی جدّ وجُہد جاری رکھ کر دوقومی نظریے کو درست ثابت کیا ہے۔ خود بھارتی حکمرانوں، سیاسی جماعتوں اور عام ہندوؤں کا مسلمانوں سے متعصّبانہ رویہ بھی دوقومی نظریے کو سچ ثابت کرتا ہے۔ اگر برِّصغیر کے مسلمان دوقومی نظریے کو رّد کر چکے ہوتے تو بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ پیش نہ آتا، دیگر بے شمار تاریخی مساجد کو گرا کر مندر تعمیر کرنے کے عملی منصوبے سننے، دیکھنے کو نہ ملتے اور بھارت کے مسلمان دیگر اقلیتوں سے بھی بدتر زندگی بسر نہ کر رہے ہوتے۔ ہندو قیادت کے تعصّب نے پاکستان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا اور آج بھارت کے اندر برپا آزادی کی 26 تحریکوں کو بھی اسی تعصب نے جنم دیا۔

مقبوضہ کشمیر میں 66 سال تک ظلم وتشدد کا ہر حربہ، ترغیب وتحریص کا ہر ہتھکنڈہ استعمال کرنے کے باوجود بھارت وہاں کے عوام کو اپنا نہیں بنا سکا جو دوقومی نظریہ کی حقانیت کا ثبوت ہے۔ پاکستان نے کشمیر پر دعویٰ نہیں کیا، اگرچہ وہ اس کا منطقی حق رکھتا ہے، بلکہ کشمیری عوام نے بار بار الحاقِ پاکستان کی خاطر رائے شماری کا مطالبہ کیا ہے۔ بھارت کو اگر خوش فہمی ہے کہ کشمیری عوام نے دوقومی نظریے کو رّد کر دیا ہے، اس لئے اب بھارت کے غلام بن کر رہنے کے لئے تیار ہیں، تو وہ رائے شماری کا اہتمام کرے۔ یہ اس کی ذمہ داری بھی ہے کیونکہ وہ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں اس کا وعدہ کر چکا ہے۔ کشمیری عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ کر کے دنیا کو بتا دیں گے کہ بھارتی حکمرانوں کی سوچ کس قدر ''حقیقت پسندانہ'' اور تاریخی حقائق سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔

دوقومی نظریہ برِّصغیر کے دیگر حصوں کے مسلمانوں کی طرح مسلمانانِ کشمیر کے ایمان کا بھی جزو ہے اور وہ بھی اس کو رّد کرنے کا الزام لگانے والوں کو رّد کرتے ہیں۔ بھارتی لیڈر جب بھی مقبوضہ وادی کا رخ کرتے ہیں، کشمیری عوام تاریخ ساز ہڑتال کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے اور بھارت سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتے۔ تازہ ترین مثال بھارتی وزیرِ دفاع کا ستمبر 2013ء کا دورۂ مقبوضہ کشمیر ہے۔ بھارتی ہیلی کاپٹروں، سنگینوں اور توپوں کے سائے میں وہ کشمیر بھر میں 14 اگست کو پاکستانی پرچم لہرا کر یومِ پاکستان مناتے، پاکستانی پرچم کو سلامی دیتے، کشمیر بنے گا پاکستان اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ وہ ہر سال 15 اگست کو بھارت کا یومِ آزادی یومِ سیاہ کے طور پر مناتے ہیں۔ اس روز تمام کاروبار بند، پہیہ جام اور مکمل ہڑتال کر کے دنیا بھر کو اپنے جذبات اور احساسات سے آگاہ کرتے ہیں۔ بھارت کی ممتاز اخبار نویس تلوین سنگھ نے مقبوضہ کشمیر کے مختلف حصوں کا دورہ کیا اور ایک معرکتہ الآرا کتاب لکھی جسے مقبوضہ کشمیر کے حالات کے متعلق ایک معتبر اور مؤقر گواہی کی بین الاقوامی سند مقبولیت ملی۔ تلوین نے لکھا:

''. . . کشمیر کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتی ہے۔ وہ اپنی گھڑیاں پاکستانی سٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق رکھتے ہیں۔ بندوق اور توپ کے زور پر ہم زیادہ دیر اُن کو دبا نہ سکیں گے . . . .''

یہ تو تھی بھارت کے مسلمانوں اور مسلمانانِ کشمیر کی بات۔ پاکستان کے ان مٹھی بھر افراد کو چھوڑ کر جو کندھوں پر امن کا لاشہ اُٹھائے، اپنے آقاؤں کی بھاشا الاپتے، من میں سرحدوں کو ختم کرنے کی آشا لئے اکھنڈ بھارت میں ہندوؤں کا غلام بننے کے سفر پر گامزن ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اہلِ پاکستان کی بھاری اکثریت اب بھی دوقومی نظریہ کی حقانیت کی پورے ایمان وایقان کے ساتھ قائل ہے اور اس کی عملی تصویر، اسلامی جمہوریہ

پاکستان' پر جان قربان کرنے کے لئے ہر آن آمادہ و تیار۔ اس لئے پاکستان کا ازلی دشمن جب بھی پاکستان پر جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے' قیامِ پاکستان یا نظریۂ پاکستان یعنی دوقومی نظریے پر اہلِ پاکستان کا ایمان مزید مضبوط ہو جاتا ہے' اور پاکستانیوں کی وہ نسل جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہندو تسلط کی ذلت سے محفوظ رہی اور اس وجہ سے اس کی زہرناکیوں سے بخوبی آگاہ نہیں' ہندو ذہنیت سے باخبر' چوکنا اور ہوشیار ہو جاتی ہے۔

پاکستان کے مشن کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے جو کہ اقامتِ دین اور احیائے اسلام ہے۔ موجودہ عالمی حالات میں بے شک یہ مشن کٹھن ہے لیکن جس گروہ نے یہ اودھم مچا رکھا ہے کہ پاکستان کو سیکولر ازم اور لبرل ازم اختیار کرنا چاہیے' وہ اس مُلک کا دشمن ہے کیونکہ اسلام کو چھوڑ کر پاکستان کا جواز باقی نہ رہے گا۔ پاکستان ایک نظریے پر قائم ہوا' وہ نظریہ ہی ختم ہو جائے تو اس کا عملی نمونہ یعنی پاکستان کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ اگر ہم یہاں اسلام کا نظام قائم نہیں کرتے تو ہم تقسیمِ ہند کا جواز عملاً ختم کر دیتے ہیں۔ اگر یہاں لادینی نظام قائم ہوتا ہے تو (خدانخواستہ) اکھنڈ بھارت کا خواب پورا ہونے میں کتنی آسانی ہو جائے گی؟ اس کے لیے سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ یوں پاکستان کے مشن کی تکمیل کا اہم تقاضا ہے کہ داخلی مُلک دشمن گروہ کو ٹوکا جائے' روکا جائے۔ ہماری تمام تر کاوشیں اسلام کے معاشرتی اور معاشی عدل کی بنیاد پر وہ جمہوری نظام قائم کرنے پر مرکوز ہونی چاہئیں جس میں قرآن وسنت کو ہر شعبۂ حیات میں فیصلہ کُن مقام حاصل ہو۔ اِس کے قیام سے ہمارا معاشرہ درست رہے گا۔ ہم میں خارجی قوتوں کی مزاحمت کی صلاحیّت پیدا ہوگی اور ہم اپنے بنیادی حقوق کو ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اس حوالے سے بھی مسلمانانِ برّصغیر کی رہنمائی کی' گویا

اندھیری شب ہے' جُدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لیے ہے مِرا شعلۂ نوا قِندیل

اپنے عہد ساز خطبۂ الہ آباد کے آخر میں کہا:

...One lesson I have learnt from the history of Muslims, is that at critical moments in their history, it is Islam that has saved Muslims and not *vice-versa*. If today you focus your vision on Islam and seek inspiration from the ever-vitalizing idea embodied in it, you will be only reassembling your scattered forces, regaining your lost integrity, and thereby saving yourself from total destruction....

آج بھی ہم واہگہ کی سرحد پر کھڑے ہو کر دیکھ لیں کہ کیا کوئی پہاڑ پاکستان اور بھارت کو الگ کر رہا ہے؟ کیا ان کے درمیان کوئی دریا حائل ہے جو دونوں ملکوں کے لیے میلوں لمبی سرحد بن گیا ہو؟ کیا انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے والی کوئی دوسری جغرافیائی رکاوٹ موجود ہے؟ اس کے برعکس وہاں کھڑے ہو کر تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس جگہ پاکستان کی سرحد ختم ہوتی اور کہاں سے بھارت شروع ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اصل سرحد دین اور لادینی کی ہے۔ جو لوگ پاکستان میں سیکولرزم یا کوئی لادینی نظریہ لانا چاہتے ہیں' وہ (خاکم بدہن) اس سرحد کو مٹانا اور پاکستان کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

[ایک سبق جو مَیں نے مسلمانوں کی تاریخ سے سیکھا' یہ ہے کہ مصیبت اور آزمائش کی ہر گھڑی میں اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے' مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آپ بھی آج ہی اسلام سے رشتہ جوڑ لیں اور اس کے دائمی قوت اور زندگی بخشنے والے نظریات سے روشنی اور رہنمائی حاصل کریں' تو آپ کی گم شدہ اور بکھری ہوئی قوتیں نئے سرے سے یک جا ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت اور بربادی سے بچ جائے گا]

داخلی محاذ استوار ہو جائے تو خارجی شر پسندوں کی بھڑکائی ہوئی دہشت گردی اور تفرقہ بازی کی آگ کی پروا نہیں۔ مادیت پرست طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے اُن کی قوتِ مادیت کا مظاہرہ نہیں ہوتا بلکہ اُن کی پریشانی کا اظہار ہوتا ہے جو انہیں اپنے معاشروں کے اندرونی تضادات سے لاحق ہے۔ یہ معاشرے کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ مغرب کی قوم پرستی نے جو تنگ خیالی پیدا کی ہے' وہ روز افزوں وحدتِ جسمانی سے برسرِ پیکار ہے۔

روس نے 1917ء میں جو انسانیت کُش نظام اپنے عوام اور مقبوضہ اقوام پر مسلّط کیا' زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ سب سے پہلے علامہ اقبالؒ نے 1918ء میں کہا کہ اشتراکی نظام کی طبعی عمر ستّر برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ وہی ہُوا' ٹھیک ستّر برس بعد اس کی تجربہ گاہ' سوویت یونین کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے' اور یوں ہوئے کہ کوئی اِدھر گرا' کوئی اُدھر گرا۔ یہی بات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے 1941ء میں کہی کہ وقت آئے گا جب کمونزم خود ماسکو میں اپنے بچاؤ کے لیے پریشاں ہو کر جائے پناہ ڈھونڈے گا۔ سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی یورپ اور نیویارک میں اپنے تحفظ کے لیے تھر تھر کانپ رہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے' ان اکابرین کی یہ باتیں سو فیصد درست ثابت ہوئیں۔

سوویت یونین کے انتشار اور کمونزم کے سنگسار ہونے کے بعد مغرب سے آوازیں اُٹھیں کہ تاریخ نے فیصلہ دے دیا' اب سرمایہ دارانہ نظام اور سیکولر جمہوریت پوری فتح مندی کے ساتھ دنیا کا واحد نظام ہے۔ سوویت روس کی تکا بوٹی کے بعد ہمارے نام نہاد اشتراکی اور ترقی پسند ''دانشور'' بھی جدیدیت اور روشن خیالی کا چولا پہن کر مغرب سے اُٹھنے والی آواز ''سرمایہ دارانہ معیشت اور سیکولر نظام زندہ باد'' میں آواز ملا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا دیکھئے' مغربی دُنیا کے 80 ممالک کے 971 شہروں میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف انہی ممالک کے عوام نے ''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' کے عنوان و اعلان سے مظاہرے کیے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور سودی کاروبار کی ناکامی کا بنیادی سبب یہاں کے بینکاروں اور سیاستدانوں کا اخلاقی دیوالیہ پن ہے۔ امریکہ اور یورپ کی حکومتیں سودی قرضوں پر چلنے والی معیشت کو سہارا دینے کے نام پر عوامی بینکوں سے لی ہوئی رقم جہاں اور جس طرح اُڑا رہی ہیں' عوام اُس سے آگاہ ہیں اور اس استحصالی نظام کو مزید اپنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ امریکہ کی معیشت بُری طرح لڑکھڑا رہی ہے' ستمبر/اکتوبر 2013ء میں امریکی حکومت کے محکمے شٹ ڈاؤن پر چلے گئے یعنی سوائے انتہائی ضروری اور سکیورٹی سے متعلق محکموں کے' تقریباً تمام سرکاری ملازمین کو بغیر تنخواہ جبری طور پر گھر بھیج دیا گیا' بے شمار سرکاری اداروں کو تالے لگ گئے۔ امریکی حکومت کے ڈیفالٹ کا خدشہ سر پر آ گیا تو وقتی معاشی اقدامات کی مدد سے ڈیفالٹ کو وقتی طور پر ٹالا اور شٹ ڈاؤن کو ختم کیا جا سکا۔ ان حالات میں سرمایہ دارانہ نظام اور سیکولر جمہوریت کے وکیل اب امریکہ اور یورپ میں ہی

اس کی تدفین کے منتظر ہیں۔

دراصل اقوامِ عالم کو اپنے بچاؤ کے لیے جو فلسفۂ زندگی درکار ہے، وہ صرف اِسلام کی تعلیمات میں موجود ہے۔ اِسی لیے وہ اسلام کی طرف آنے پر مجبور ہیں۔ حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے تقریباً بارہ سالہ دورِ حکومت میں سوشل سکیورٹی سمیت 26 رفاہی ادارے وجود میں آئے۔ تیرہ سو سال بعد مغرب نے سوشل سکیورٹی کے ان تصورات کو اس دور کے تقاضوں کے مطابق نئی شکل دے کر اپنے ہاں رائج کیا' مغرب میں اسے عمر لاء (Umer's Law) بھی کہا جاتا ہے۔ ''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' مہم کے دوران پوری دنیا کے چینلز پر ''اسلامی نظامِ معیشت ہی مسائل کا حل ہے'' کے لاتعداد بینرز بھی نظر آئے۔ اور ابھی کل کی بات کہ 29 اکتوبر 2013ء کو برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون نے عالمی اقتصادی فورم سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''. . . اسلامی بنکاری نظام دوسرے نظاموں سے پچاس فی صد تیز ترقی کر رہا ہے۔ اسلامی بنکاری نظام کو پوری دنیا میں پذیرائی مل رہی ہے۔ ہم لندن سٹاک مارکیٹ میں اسلامک انڈکس بھی قائم کریں گے۔ برطانیہ اسلامی بانڈز جاری کرنے والا پہلا غیر اسلامی ملک ہوگا . . . .'' (بی بی سی' لندن' 29 اکتوبر 2013)

اس حوالے سے پہلی شرطِ ایمان یہ ہے کہ پاکستان کی اُمّتِ مُسلمہ اپنے رب سے رشتہ جوڑے اور مضبوطی سے اس پر جم جائے۔ یہی رشتہ شاہراہِ ترقی اور پھر منزلِ مقصود پر لے جاتا ہے۔ دوسری اہم شرط اپنے آپ کو مایوسی سے نکالنا ہے۔ مایوسی اسلام کی نگاہ میں کُفر ہے اور اسلام اپنے ماننے والوں کو اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے اور مدد طلب کرنے کا حُکم دیتا ہے۔ بے شک حالات بہت زیادہ اچھے نہیں' ایک کے بعد دوسری آزمائش سامنے آرہی ہے'

> ہر وہ چیز ہمارے لئے زہر ہے جو اللہ سے ہمارے تعلق کو ضعف پہنچانے والی ہو' جو اللہ کا خوف ہمارے دلوں سے نکالنے والی ہو۔ آج دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو ہم سے بڑھ کر اسلام کی احسان مند اور اس کے فیض کی حاجت مند ہو۔ ہم تو اپنے وجود کے لیے بھی اسی کے رہینِ منت ہیں اور ہماری بقا بھی اسی پر منحصر ہے۔
>
> [آغا شورش کاشمیری: زندہ باد]

لیکن تاریخ کے دوسرے رُخ کو دیکھا جائے تو پاکستان نے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ان سے بھی بدتر طوفانوں کا منہ پھیر دیا۔

مکمل معاشی بے سروسامانی میں اپنے سفر کا آغاز کرنے والی پاکستانی قوم نے آزادی کے دس سال کے اندر معاشی ترقی کا ریکارڈ قائم کیا اور جب بھارت کی معیشت سنبھلنے کی ہر کوشش کے باوجود مسلسل بحران کا شکار تھی اور اس کے عدم ترقی کے ریکارڈ کو ''ہندو ریٹ آف گروتھ'' کا نام دیا جارہا تھا' پاکستان کی معیشت نے اوسطاً 5 سے 6 فیصد سالانہ کا ریکارڈ قائم کیا۔ یورینیم کی افزودگی کا وہ عمل جس کے لیے امریکہ نے دس سال کا عرصہ لیا تھا' پاکستان نے اپنے رب کی مہربانی اور اپنے سائنسدانوں کی جانفشانی کی بدولت تمام تر پابندیوں کے باوجود یہ سفر سات سال میں طے کر کے باصلاحیت اور پُرعزم قوم ہونے کا ثبوت دیا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستان کا سب سے بڑا اثاثہ یعنی عوامی شعور مضبوط اور توانا ہے۔ ملک سے دلی محبت رکھنے والے پاکستانی عوام نے ہر قسم کے حالات' سامراجی دباؤ اور داخلی تخریب کاری کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ میڈیا اور سول سوسائٹی نے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ عالمی و مقامی طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے جنم لینے والے این آر او جیسے شرمناک معاہدے کی

پارلیمنٹ سے توثیق نہ کرائی جاسکی۔آمر کے خلاف ایک دلیرانہ انکار سے برپا ہونے والی باعثِ صد افتخار تحریک کے نتیجے میں بحال ہونے والی آزاد عدلیہ' آئین اور قانون کی بالا دستی کے لیے مصروفِ عمل ہے۔ گھناؤنے رازوں سے پردے اُٹھ رہے ہیں' بڑے بڑے مگرمچھوں پر ہاتھ ڈالنے کی روایت کا آغاز ہو چُکا۔ بے پناہ عالمی سفارتی ومعاشی دباؤ کے باوجود اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہم نے ایٹمی اثاثوں پر کوئی مفاہمت نہیں کی۔ دشمن کا پالتو پاکستانی ٹولہ پوری قوت اور شدت کے ساتھ ہماری نظریاتی سرحدوں پر حملہ آور ہو چکا ہے۔ غیر ملکی فلمیں' ڈرامے اور کارٹون قیامت ڈھا رہے ہیں اور اپنے ہی وطن کے خلاف بدکلامی کا دھندہ زوروں پر ہے۔ان شاءاللہ تعالیٰ ہمیں ہماری نظریاتی 'ملّی وتہذیبی شاہراہ سے ہٹانے کے لیے عالمی سامراج اور اس کے مقامی گماشتوں کی تمام فکری اور ثقافتی کوششیں ناکام ونامراد ٹھہریں گی۔

پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے مایوسی پھیلانے والے جان لیں کہ بجلی کے پُر اسرار بحران کے باوجود اس ملک کی جڑوں میں 200 سال کے لیے توانائی کا ذخیرہ موجود ہے۔صرف تھر میں ہی 75 ارب ٹن کوئلہ کے ذخائر موجود ہیں' جن سے 30 برس تک 10 ہزار میگاواٹ بجلی فراہم کی جاسکتی ہے۔ ماشاءاللہ پاکستان ایٹمی قوت ہے۔اس کی آبادی میں 60 فی صد سے زیادہ 30 سال کی عمر کے نوجوان ہیں۔اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے نوجوانانِ پاکستان دنیا بھر کی ممتاز درسگاہوں اور پُر پیچ عمل گاہوں میں اپنی محنت ولیاقت کا لوہا منوا رہے ہیں۔سال کے چار موسموں والے ملک پاکستان کے مختلف حصوں میں پورا سال مختلف قسم کے پھل اور اجناس پیدا ہوتی ہیں۔حیرت انگیز گلیشئر' فلک بوس اور برف پوش پہاڑ' بیش قیمت اور نایاب معدنیات سے مالا مال کوہستانی سلسلے' زرعی اجناس اُگلنے والے سرسبز و زرخیز میدان' ہر قسم کی لکڑی اور طبّی بوٹیوں سے لبریز جنگل' حیران کُن چرند و پرند کی آماجگاہ صحرا' زمین کی رگوں میں آبِ حیات اُتارنے والے دریا' خیرہ کُن مقامی اور مہاجر آبی پرندوں کی میزبان جھیلیں' دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اشیائے ضروریہ کی فراہمی کا راستہ دینے والے سمندر اور سٹریٹیجک اہمیت کا حامل محلِ وقوع' الغرض قرآنِ پاک کی سورۃ الرحمٰن میں اللہ پاک کی بیان کردہ کونسی نعمت ہے جو الحمدللہ! یہاں نہیں اور دنیا کا وہ کونسا ملک ہے جہاں یہ ساری نعمتیں پائی جاتی ہیں؟

اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کمی کسی شے کی نہیں۔بس ضرورت ہے داخلی ریاضت کی جس کی بدولت ایمان کی فراست سے مستقبل کے خاکے کو ملّی ضروریات کے تحت ایمانداری و دانشمندی سے ترتیب دیا جائے۔قوم کو آزادی' خودمختاری' سماجی مساوات' انصاف' خوداعتمادی اور خوداحصاری کے راستے پر گامزن کر کے اس راستے کی ہر رکاوٹ کو مومنانہ جرأت سے ہٹا دیا جائے۔یہ کوئی ناممکن بات نہیں۔عین اُس وقت جب برّصغیر کے مسلمانوں کے خلاف خوفناک ترین سازشیں جاری تھیں' اُن کی قومی زندگی پر نزع کا عالم طاری تھا' انگریز اور ہندو اپنے خیال میں اس خطے کے مسلمانوں کو زندہ واپس نہ آنے کے لیے تاریکیوں کے جنگل میں دھکیل چکے تھے' تو کیا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے قائدِاعظم محمد علی جناحؒ اپنی قوم کو آزادی کے نُور سے جگمگ گلستان-پاکستان- میں نکال نہ لائے تھے؟ کیا اُس وقت ساری دنیا پکار نہ اُٹھی تھی کہ

ہَوا ہے گو تُند و تیز لیکن' چراغ اپنا جَلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خُسروانہ

سروسہارنپوری

پاکستان کا مطلب کیا

قدر[1] کی رات کا تحفہ ہے ختمِ رُسلؐ کا صدقہ ہے
اپنے عقیدے کا اعلان اپنا مُلک یہ پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ!

اپنے اللہ کا انعام اپنی زمیں پہ اپنا نظام
اس کا رہبر ہے قرآن اپنا مُلک یہ پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ!

یہ اپنی پہچان بھی ہے یہ اپنا عنوان بھی ہے
یہ اپنا ایمان بھی ہے اپنا مُلک یہ پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ!

سب صوبے پائندہ ہیں اس کے محافظ[2] زندہ ہیں
اپنی وحدت کا عنوان اپنا مُلک یہ پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ!

طلبۂ فوجی اور جوان اس کی حفاظت پر قربان
شوقِ شہادت اِن کی آن اپنا مُلک یہ پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ!

جوہری طاقت کا میدان اب ہے اپنے زیرِکمان
یہ ہے اللہ کا احسان اپنا مُلک یہ پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ!

نورِ وحدت کی تنویر حُبِ رسالتؐ کی تعبیر
نظم و ضبط کا ہے فیضان اپنا مُلک یہ پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ!

1۔ پاکستان کا قیام لیلۃ القدر میں عمل میں آیا 2۔ افواجِ پاکستان

ممتاز اقبال ملک

ہماری بنیاد

اسلامی جمہوریہ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کا خواب دیکھنے والا ایک محدود سا طبقہ قائدِ اعظمؒ کو سیکولرازم کا حامی بنا کر پیش کرنے لگا ہے۔اس میں شک نہیں کہ قائدِ اعظمؒ مغربی لباس پہنتے اور اکثر انگریزی زبان بولتے تھے۔وہ فقہی اختلافات سے بے تعلق رہے اور ان کی زندگی میں روایت پسندی کی جھلکیاں بھی بہت کم ملتی ہیں۔ یہ ساری باتیں مسلمانوں میں موجود اُس چھوٹے لیکن اثر پذیری کے اعتبار سے اہم طبقے کی خواہشات کے مطابق نظر آتی ہیں جو خود کو سیکولر رجحانات کا حامل قرار دیتا اور اس پر فخر کرتا ہے۔

معاملہ اختلافِ رائے یا دینی موضوعات پر عملی اور فکری انداز میں بحث کا نہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا دیگر مذاہب کے موجودہ ماننے والوں کے اعلانات کے پیشِ نظر مسلمان کو بھی مذہب کو صرف افراد کا شخصی اور انفرادی مسئلہ سمجھ کر محض عبادات اور بعض دیگر رسومات تک محدود سمجھنا چاہیئے یا ایک اصل، محفوظ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والی آخری ہدایت ہونے کی بناء پر اسلام اپنا دائرہ اثر صرف فرد کی زندگی تک

سیکولرازم (دہریت، لادینیت) اور تھیوکریسی (پاپائیت) خالصتاً مغربی اصطلاحیں ہیں۔مغربی دنیا میں مذہب کو پرائیویٹ، انفرادی اور ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔یہودیت اور نصرانیت کے پیروکاروں نے مذہب کو تھیوکریسی قرار دے کر اس کے خلاف یکے بعد دیگرے بغاوتیں کیں کیونکہ پوپ اور بادشاہ اپنا خود ساختہ حقِ آسمانی (Divine Right of King) سمجھ کر عوام کا خون نچوڑتے اور عیش کرتے تھے۔اس کے ردِعمل میں جدید دنیا نے مذہب کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا۔فرانسیسی مفکرین والٹیئر اور روسو نے اس سوچ کو کامیاب بنانے میں مدد دی۔ خدا، وحی، الہام وغیرہ کو تھیوکریسی کی تخلیق قرار دے کر غیر ضروری سمجھا گیا۔بادشاہ کا حقِ آسمانی چھین لینے، پوپ کا ریاستی اُمور میں عمل دخل بند کر دینے اور چرچ کو سیاست سے علیحدہ کر دینے کے بعد تھیوکریٹک سٹیٹ کی جگہ سیکولر سٹیٹ وجود میں آئی۔تھیوکریٹک سٹیٹ میں مذہبی اجارہ داری ہوتی ہے۔مذہبی اقلیتوں سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔سیکولر ریاست کے دو اصول ہوتے ہیں: اول، حکومتِ وقت غیر مذہبی بنیادوں پر قائم سیاسی پارٹیوں ہی کی اجازت دیتی ہے، مذہبی پارٹیوں پر پابندی ہوتی ہے۔دوئم، سیکولر ریاست جداگانہ انتخابات کی اجازت نہیں دیتی۔اس میں اقلیتوں کا تصوّر نہیں ہوتا۔اسلام دین اور دنیا میں وہ امتیاز قبول نہیں کرتا جو نصرانیت اور یہودیت مذہب اور دنیاویت میں کرتی ہے۔کیونکہ اسلام میں دین اور دنیا ایک دوسرے سے وابستہ اور لازم و ملزوم ہیں۔مسلمان پر دنیا میں رہ کر دینی اقدار کا تحفظ اور ان پر عمل ضروری ہے۔اسلامی ہدایات (قرآن مجید و احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) محفوظ، مکمل اور ابدی ہیں۔اسلام کے اصول ہر دور کے حالات اور تقاضوں پر لاگو ہوتے ہیں۔وحی کا سلسلہ بند اور اسلام کے مکمل ہو جانے کی بنا پر مسلمان کو اب دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔اسلامی ریاست میں مذہب ماسوائے چند عبادات کے، پرائیویٹ معاملہ نہیں بلکہ ریاست کا دستور، معیشت، معاشرت، سیاست، عدل و انصاف اور زندگی کے تمام معاملات اسلام کے تابع ہیں۔تھیوکریسی کے برعکس اسلام نے اُمتِ مسلمہ کو تین اہم اختیارات دیئے ہیں: 1۔اختیارِ وسائلِ معاش 2۔اختیارِ تعبیرِ قانونِ شریعت 3۔اختیارِ حکمرانی۔اسلامی ریاست میں مذہبی اجارہ داری نہیں ہوتی۔اس میں ہر مذہبی اقلیت کو مذہبی، سیاسی اور معاشرتی آزادی حاصل ہوتی ہے، بشرطیکہ اقلیت ریاست کی وفادار رہے اور اسلام دشمن کارروائیوں میں حصہ نہ لے۔

محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے پوری مملکت کی تمام سمتوں تک وسیع کر دیتا ہے۔ کیا اسلام پر ایمان لانے کے بعد بھی مسلمان زندگی کی ہمہ جہت کامیابیوں کے لئے دیگر افکار و نظریات سے ہدایت کا محتاج رہتا ہے یا فرد اور قوم دونوں کے لئے اسلام ہر سطح اور ہر سمت میں ہدایت اور رہنمائی کے لئے کافی ہے؟ یہ سوال اہم ہے اور اس کے جواب پر ہی ایمان کی وسعتوں کا انحصار ہے۔ قرآن کریم اور سیرتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں اس سوال کا جواب بالکل واضح اور روشن ہے اور وہ یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے قرآنِ کریم کی تعلیمات و ہدایات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ اقدس کی رہنمائی کافی ہے۔ ہمیں صرف اتنا کرنا ہے کہ زمان و مکاں کے تقاضوں کے پیشِ نظر ان کے اطلاق کے طریقوں پر غور کریں۔ 1940ء کے بعد سے اپنی وفات تک قائدِ اعظمؒ نے اپنی مختلف تقریروں میں بیسیوں بار اس حقیقت کا اظہار کیا کہ پاکستان میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی نافذ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ 1940ء کے بعد سے اس لئے کہ اسی سال قراردادِ لاہور کے ذریعے برِّصغیر کے مسلمانوں نے حصولِ پاکستان کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ بے شمار ایسی تقاریر ہیں جن میں قائدِ اعظمؒ نے اسی عہد کو دہرایا ہے، مگر نمونے کے لئے صرف دو تقاریر کے اقتباسات:

25 جنوری 1945ء کو کراچی بار ایسوی ایشن سے خطاب میں قائدِ اعظمؒ نے کہا ''... میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابلِ عمل ہیں جس طرح تیرہ سو برس پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کو بھی یہاں کوئی ڈر اور خوف نہیں ہونا چاہیے، ہر فرد سے انصاف اسلام کا بنیادی اصول ہے ....''

اسلامی نظام سے گہری وابستگی کی گواہی ان کی اس تقریر میں بھی موجود ہے جو انہوں نے یکم جنوری 1948ء کو سٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب کے موقع پر کی تھی۔ انہوں نے کہا ''... مغربی دنیا صنعتی مہارت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین باطنی بحران میں مبتلا ہے۔ اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظریہ اور نظام اختیار کیا تو عوام کی خوش حالی حاصل کرنے کے لئے اپنے نصب العین میں ہمیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ اپنی تقدیر ہمیں اپنے منفرد انداز میں بنانا پڑے گی۔ ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی اصولوں پر قائم ہو۔ ایسا نظام قائم کر کے گویا ہم بحیثیت مسلمان اپنا فرض ادا کریں گے ....''

قائدِ اعظمؒ کی دو تقاریر کے یہ مختصر مختصر سے اقتباسات بالکل واضح، نمایاں اور غیر مبہم ہیں۔ کچھ لوگ قائدِ اعظمؒ کی گیارہ اگست 1947ء کی تقریر کے دو جملوں کی بنیاد پر، جن میں انہوں نے مذہب کو ذاتی مسئلہ قرار دے کر کہا تھا کہ اس کا مملکت کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر نظام کے قیام کے حامی تھے۔ آگے چلنے سے پہلے قائدِ اعظمؒ کی گیارہ اگست 1947ء کی تقریر کے ان جملوں کو ایک بار پڑھ لیا جائے۔ زیرِ بحث جملے یہ ہیں'' ... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہ رہے گا اور مسلمان مسلمان نہیں رہے گا۔ مذہبی مفہوم میں نہیں، کیونکہ وہ ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے، بلکہ سیاسی مفہوم میں، اس مملکت کے شہری کی حیثیت سے ....''

سوال یہ ہے کہ یہ نکتہ بیں حضرات قائدِ اعظمؒ کی اس سے پہلے اور اس کے بعد کی تقریروں کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ قائدِ اعظمؒ کی بیسیوں تقاریر ہیں جن کو پڑھنے سے اُن کی اسلام سے وابستگی اور پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ سے دلچسپی میں کوئی شک نہیں رہتا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اوپر دیئے گئے دو اقتباسات گیارہ اگست 1947ء والی تقریر سے پہلے اور بعد کی تقریروں سے لئے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا قائدِ اعظمؒ صرف گیارہ اگست 1947ء کو سیکولر نظام کے حامی بنے اور اس سے قبل اور اس کے بعد بھی پاکستان میں اسلام کے عادلانہ سماجی نظام کے حامی بنے رہے؟ کیا وہ تبدیلی صرف ایک دن کے لئے تھی؟ ظاہر ہے ایسا نہیں۔ کیا وہ لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کے قول و فعل میں تضاد تھا اور سیکولرازم کے حامی ہونے کے باوجود وہ اسلامی نظام کے قیام کی حمایت بھی کرتے رہے؟

جہاں تک قائدِ اعظمؒ کی شخصیت اور کردار کا تعلق ہے، وہ آئینے کی طرح صاف اور روشن ہے۔ ان کے شدید ترین مخالفین بھی ان پر دورنگی کا الزام عاید نہیں کر سکتے۔ قائدِ اعظمؒ نے زندگی کا طویل عرصہ سیاست میں گزارا اور کبھی دروغ گوئی اور مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا۔ 1939ء میں شملہ آمد پر جلوس کے دوران قائدِ اعظمؒ رکشہ میں سوار تھے جسے لوگ رسے سے باندھ کر عقیدت کے طور پر کھینچ رہے تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے اپنا ہیٹ گھٹنوں پر رکھا ہُوا تھا۔ کسی نے ان سے درخواست کی کہ انگریزوں کی اس علامت کو مسلمان پسند نہیں کرتے، اس لئے وہ ہیٹ گھٹنوں سے اُٹھا کر پاؤں میں رکھ لیں تو مسلمان خوش ہو جائیں گے۔ قائدِ اعظمؒ نے گھٹنوں پر رکھا ہیٹ سر پر رکھتے ہوئے فرمایا: ''مَیں آج نہیں، برسوں سے ہیٹ پہنتا ہوں۔ مَیں منافقت نہیں کروں گا۔'' [منیر احمد منیر: آتش فشاں، دسمبر 1977ء]

> اللہ تعالیٰ جن لوگوں سے محبت کرتا ہے، ان کو امتحان اور آزمائش میں بھی ڈالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو قیمتی ترین چیز قربان کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہوئے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کی قربانی پیش کی۔ آج اللہ کریم ہمارا امتحان لے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سے بڑی قربانیاں طلب کی ہیں۔ چاروں طرف سے تاریک بادلوں نے ہمیں گھیر رکھا ہے، مجھے یقین ہے کہ اگر ہم نے قربانی کا وہی جذبہ پیش کیا، جو حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا تو مصیبتوں کے تاریک بادل چھٹ جائیں گے اور اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کی طرح ہم پر بھی اپنی رحمتوں کی بارش برسائے گا۔ آئیے عیدالاضحیٰ کے دن جو اسلام کے جذبۂ ایثار اور قربانی کا مظہر ہے، جس کی اسلام نے ہمیں تعلیم دی ہے، عہد کریں کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق پاکستان کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے میں پیچھے نہ رہیں گے۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ ہم مشکلات پر غالب آئیں گے۔ کیونکہ ہم اپنی طویل تاریخ کے دوران ایسے کئی طوفانوں کے منہ پھیر چکے ہیں۔ دشمن اپنی کوششوں میں مصروف ہیں، مگر اللہ کی مدد سے ہم مشکلات کی اس تاریک رات سے کامران ہو کر نکلیں گے۔ اور دنیا کو دکھا دیں گے کہ پاکستان محض زندگی کے لئے نہیں، بلکہ اچھی زندگی گزارنے کے لئے بنا ہے۔ [قائدِ اعظمؒ: پیغامِ عید، 24 اکتوبر 1947ء]

قائدِ اعظمؒ فکری اور ذہنی اعتبار سے اسلام کی حقانیت کا علمبردار ہونے پر فخر کرتے تھے۔ وہ اسلام کے سماجی اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں پہل کرتے تھے اور آرزومند تھے کہ برِصغیر کے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر ان اصولوں کے مطابق معاشرتی نظام مرتب کرنے کے لئے سازگار فضا میسر آجائے۔

بہت سے ذہنوں میں دستور ساز اسمبلی میں قائدِ اعظمؒ کی گیارہ اگست 1947ء والی تقریر میں موجود ان الفاظ کے بارے میں تجسّس پیدا ہوتا ہے اور لوگ یہ بات معلوم کرنے کے خواہشمند رہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ نے وہ الفاظ کس پس منظر میں ادا کئے تھے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے بھی قائدِ اعظمؒ ہی کے ایک بیان کا حوالہ ضروری ہے جو انہوں نے گیارہ نومبر 1947ء کو دیا تھا۔

اس بیان کا پس منظر بہت اہم تھا اور وہ اس صورتِ حال سے بہت مماثلت رکھتا تھا جو قیامِ پاکستان کے اعلان کے بعد سے مسلم کُش فسادات کی صورت میں مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں، مشرقی پنجاب میں بطورِ خاص

بہت المناک طور پر نمایاں ہوئی۔ 20 اکتوبر سے 10 نومبر 1946ء تقریباً 19 دنوں تک صوبہ بہار میں شدید مسلم کُش فسادات ہوئے۔ مسلم لیگ کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ان فسادات میں تقریباً پچاس ہزار مسلمان شہید اور بے شمار زخمی ہوئے۔ مالی نقصان کتنا ہوا' وہ بے اندازہ تھا۔ ظاہر ہے وہ بہت المناک اور ساتھ ہی ساتھ نہایت اشتعال انگیز صورتِ حال تھی۔ اس کے باوجود قائدِ اعظمؒ نے گیارہ نومبر 1946ء کو اپنے بیان میں کہا ''. . . اگر آپ حقیقت میں پاکستان چاہتے ہیں تو مَیں اللہ کریم سے دُعا کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے دامن پر وہ بدنما داغ نہ لگنے دے جس کا مظاہرہ مجبور اور نہتے مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کی صورت میں صوبہ بہار میں کیا گیا ہے۔ ہمیں تہذیب و شرافت کو کبھی ہاتھوں سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے' لیکن ہم مسلم اکثریت والے صوبوں میں بے گناہوں کو مار کر اپنا دل ٹھنڈا نہیں کریں گے۔ ہمیں دوسروں کو بتا دینا چاہیے کہ ہم اپنے دشمنوں کو معاف کرنے والے بہادر' ایماندار اور سچے مسلمان ہیں۔ پاکستان میں غیر مسلم اپنی جان و مال اور عزت کی حفاظت مسلمانوں سے بڑھ کر پائیں گے . . . .''

بات یہیں ختم نہیں ہوتی' اس کے بعد قائدِ اعظمؒ نے اپنے اسی بیان میں یہ بھی کہا'' . . . اگر مسلمانوں نے دامنِ صبر ہاتھوں سے چھوڑ دیا اور اپنا توازن کھو دیا اور اسلام نے جو عدیم المثال سبق سکھایا ہے' اسے بُھلا دیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ حصولِ پاکستان سے محروم ہو گئے اور ہندوستان میں وہ خونریزی ہوگی کہ ہماری آزادی کے دن دُور ہو جائیں گے۔ ہم اپنی غلامی کی بیڑیاں اپنے ہی ہاتھوں سے مضبوط کریں گے . . . .''

اکتوبر' نومبر 1946ء میں بہار میں مسلمانوں کے قتلِ عام پر کرب و الَم کی بھرپور شدتِ احساس کے ساتھ قائدِ اعظمؒ کا یہ بیان ان کے ایمان کی پختگی اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ پاک سے حسبِ مقدور روشنی حاصل کرنے کے عزم کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی گیارہ اگست 1947ء کی دستور ساز اسمبلی کی تقریر میں اسی بات کو دوہرایا تھا جو انہوں نے گیارہ نومبر 1946ء کے بیان میں کہی تھی۔ اُس وقت اس بات کا دوہرانا بہت ضروری تھا۔ اس تقریر کے ذریعے قائدِ اعظمؒ مسلمانوں کے اس عالمگیر ملّی تشخص کی نفی نہیں کر رہے تھے جو برِّصغیر میں دوقومی نظریے کی صورت میں نمایاں ہو کر مطالبۂ پاکستان کی بنیاد بنا۔ وہ ہمیں اسلام کی انسانیت نواز تعلیم کی روشنی دکھا رہے تھے جس کی تاریخِ عالم میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ جہاں تک مسلم دشمنی کا تعلق اور مسلمانوں کے خون بہانے کا معاملہ ہے' وہ صرف موجودہ بھارت تک ہی محدود نہیں' موجودہ دور میں تو اس کسوٹی پر اقوامِ مغرب کا کھوٹا پن بھی پوری طرح نمایاں ہو گیا ہے جو انسانی حقوق کی بہ بانگِ دُہل مسلسل دعویداری کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خون کی ارزانی کے تماشے بے حسی سے دیکھتی رہتی ہیں۔ یہ روّیہ مسلمانوں سے ان کے گہرے بغض اور اسلام کی امکانی توانائی سے ان کی خوفزدگی کا کھلم کھلا اظہار ہے۔

اس امر میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر نہیں' بلکہ اسلام کی تعلیمات اور احکامات پر مبنی دستور کے حامی تھے۔ ایک واضح ثبوت آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس سے مل جاتا ہے جو 24 دسمبر سے 26 دسمبر 1943ء تک کراچی میں منعقد ہوا۔ 26 دسمبر کو نواب بہادر یار جنگ نے خطاب کیا۔ یہ بہادر یار جنگ کی آخری تقریر تھی' وہ چھ ماہ بعد 25 جولائی 1944ء کو حیدر آباد میں یکا یک انتقال کر گئے۔ اس تقریر کے دوران نواب بہادر یار جنگ نے بالکل واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہا: ''حضرات! پاکستان کو پاکستان بنانا اور قائم رکھنا آسان نہیں۔

آپ کے قائد نے ایک سے زائد مرتبہ اس کا اعادہ فرمایا ہے کہ مسلمان اپنی حکومتوں میں کسی دستور اور قانون کو خود مرتب کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ان کا دستور مرتب اور متعین حالت میں ان کے ہاتھوں میں موجود ہے اور وہ ہے قرآن پاک . . . اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہم پاکستان صرف اس لئے نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی جگہ حاصل کرلیں جہاں وہ شیطان کے آلہ کار بن کران ہی دساتیر کا فرانہ پر عمل کریں، جن پر آج مغربی دنیا کاربند ہے۔ہم پاکستان اس لئے چاہتے ہیں کہ وہاں قرآنی نظامِ حکومت قائم ہو۔یہ ایک انقلاب ہوگا، یہ ایک نشاۃِ ثانیہ ہوگی، یہ ایک حیاتِ نو ہوگی خوابیدہ تصوراتِ اسلامی جس میں ایک مرتبہ پھر جاگیں گے اور حیاتِ اسلامی ایک مرتبہ پھر کروٹ لے گی . . . سن لیجئے اور آگاہ ہوجایئے کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہیں ہے، وہ شیطانی سیاست ہے اور ہم ایسی سیاست سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔''

اس پر قائدِ اعظمؒ نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مُکّا مار کر فرمایا: ''تم بالکل درست کہتے ہو!'' بہادر یار جنگ نے برجستہ کہا: ''لیجئے قائدِ اعظمؒ نے میرے اس قول پر مُہرِ تصدیق ثبت کردی۔''

یہ تمام تاریخی حقائق ہیں۔ان سے اس بات کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر نظام کے حامی تھے یا اُس نظام کے جس کی بنیاد قرآن وسنت پر ہو۔پاکستان میں یقیناً ایک مؤثر طبقہ ایسا ہے جو قرآن وسنت کی ان تعبیرات سے متفق نہیں ہے جو علمائے کرام کرتے ہیں، لیکن تعبیر اور تشریح سے اختلاف الگ بات ہے اور اصول سے انحراف الگ مسئلہ۔پاکستان میں سیکولر نظام کا خواب دیکھنے والوں کا یہ حق تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ علمائے کرام کی رائے سے اختلاف

> پاکستان کا دستور ابھی بننا ہے اور یہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی بنائے گی۔میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہوگا اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل۔ان اصولوں کا اطلاق آج کی عملی زندگی پر بھی اُسی طرح ہوتا ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے۔اسلام اور اس کے نظریات سے ہم نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے۔اسلام نے ہمیں مساوات، انصاف اور ہر ایک سے رواداری کا درس دیا ہے۔ہم ان عظیم الشان روایات کے وارث اور امین ہیں، اور پاکستان کے آئندہ دستور کے معمار اور بانی کی حیثیت سے ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی آگاہ ہیں۔ [قائدِ اعظمؒ: امریکی نامہ نگار سے انٹرویو، 25 جنوری 1948ء]

کریں لیکن اس کے نتیجے میں مملکتِ پاکستان کی بنیادوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا؟ یہ کسی کا حق نہیں ہے، نہ ہی کسی کو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ نہ ہی کوئی مائی کا لعل ایسی جرأت کرسکے گا۔سیدھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ ایسی کوشش کی حمایت سیکولر نظام کے حامی لوگوں کی اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔وہ انکار کررہے ہیں اس بات سے جس کا انہیں علم ہی نہیں۔قرآن مجید اپنی تعلیمات کے مخالفین سے دلیل طلب کرتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ سیکولر نظام کے حامی عملی طور پر انسان کے معاشرتی نظام کے معاملات ومسائل کو اللہ کے قانون اور اللہ کے انعامات اور اللہ کی گرفت کے دائرے سے باہر سمجھتے ہیں۔ان کا یہ خیال قطعاً درست نہیں ہے۔انسان ارادے اور اختیار کی صفت رکھتا ہے، لیکن اس کا یہ اختیار صرف عمل کی راہ قبول کرنے یا نہ کرنے تک محدود ہے۔انسان عمل پر ایک خاص دائرے میں اختیار رکھتا ہے، لیکن اعمال کے نتائج پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔اعمال کے نتیجے خواہ اچھے ہوں یا برے، اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور انسان نہ ان پر

اثر انداز ہوسکتا ہے' نہ ان کو تبدیل کرسکتا ہے۔

پاکستان کا قیام دورِ حاضر میں مملکتی سطح پر اسلامی نظام کے لئے تجربہ گاہ کے طور پر عمل میں آیا ہے۔ ہم اس مقصد سے صرف اس صورت میں انحراف کر سکتے ہیں جب ہم خدانخواستہ پاکستان کے وجود کو بھی خطرے سے دوچار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان بھی ایک ملک ہے لیکن اس ملک کی سلامتی اور استحکام کے سلسلے میں یہ بات دُہراتے رہنا ناگزیر ہے کہ پاکستان کے وجود کی بنیاد دنیا کے دوسرے ملکوں سے مختلف ہے۔ پاکستان کو پاکستان کی حیثیت سے باقی رکھنے کے لئے اس کے نظامِ اجتماعی اور اس کے دستور کا رشتہ اسلام یعنی قرآن وسنت سے برقرار رکھنا لازمی ہے۔ اس بات سے اختلاف بجائے خود درست نہیں چہ جائیکہ اس اختلاف کو قائدِ اعظمؒ کے نام کا سہارا لے کر معتبر اور مؤثر بنانے کی کوشش کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ جیسے رہنما قوموں کے لئے قدرت کا عطیہ ہوتے ہیں جو قومی زندگی کے شدید صبر آزما حالات کے چیلنج کے جواب میں سامنے آتے ہیں اور جن کے کردار کی مثالی بلندی ان کی کامیابی کی ضمانت بھی ہوتی ہے۔ ہمیں اپنی آزادی کے حصول میں قائدِ اعظمؒ کی رہنمائی میں جو کامیابی میسر آئی' وہ نہ اتفاقی تھی نہ حالات کے جبر کا نتیجہ۔ دس سال تک قوم ایک ایک قدم اس منزل کی جانب بڑھی۔ اس وقت منزل بھی تھی' متعین راستہ بھی' قومی وحدت بھی تھی اور قائد کی دیانت اور صلاحیت بھی۔ حقیقی کامیابی ان ہی اجزا کی یکجائی کا نام ہے۔ برّصغیر میں ایک آزاد اسلامی ریاست کا قیام کوئی حادثہ نہیں' صدیوں کے تاریخی تقاضوں کا منطقی نتیجہ ہے اور جو ایک فرد اس عظیم المثال کامیابی کی علامت ہے' اس کا نام محمد علی جناحؒ ہے جسے ہم نے بصد فخر اپنا قائدِ اعظمؒ کہا۔

قائدِ اعظمؒ نے بیسویں صدی میں نہایت بلند رتبہ سیاست دان ہوتے ہوئے بلند کرداری اور صداقت و دیانت کا دامن ہاتھوں سے کبھی نہ چھوڑا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ دھوکے اور فریب کے بغیر بھی سیاست میں بھرپور اور مکمل کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے یہ عمل بجائے خود ایک جہاد ہے جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر پختہ ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔

ظاہری وضع قطع کے خود ساختہ اصولوں کو اسلام کی بنیاد قرار دے کر ہم جو چاہیں سوچیں اور جو چاہیں کہیں' لیکن سچی بات یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے افکار و عمل مجموعی طور پر ان اصولوں کی خوشبو میں رچے بسے تھے جنہیں اسلام نے انسانیت کی فلاح کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔

قائدِ اعظمؒ کو سیکولر کہنے یا سمجھنے اور پاکستان کے سیکولر سٹیٹ بننے کا بے تعبیر خواب دیکھنے والا ٹولہ منفرد صحافی جناب خالد محمود ربّانی مرحوم کی کتاب ''قائدِ اعظمؒ اور ان کے معالج'' سے لی گئی یہ چند سطریں آنکھیں کھول کر پڑھ لے۔ یہ رحلت سے صرف 9 دن پہلے 2 ستمبر 1948ء کو زیارت میں قائدِ اعظمؒ کے معالجِ خصوصی کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش کے ایک سوال کا جواب ہے۔ ذرا سی بھی اخلاقی جرأت ہے' تو سچ بتائیں کہ کیا کوئی سیکولر انسان یہ کہتا ہے:

... مَیں نے بہت دنیا دیکھ لی' اللہ تعالیٰ نے عزت' دولت اور شہرت بھی بے حساب دی۔ اب ایک ہی تمنّا ہے کہ جب مروں تو دل گواہی دے کہ جناح نے اللہ کے دین اسلام سے خیانت اور پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کی اُمت سے غداری یا بے وفائی نہیں کی۔ مسلمانوں کی آزادی میں اپنا کردار بغیر کسی کوتاہی کے' حتیٰ الوسع ٹھیک ٹھیک ادا کیا اور میرا خدا کہے کہ اے میرے بندے بے شک تُو مسلمان پیدا ہُوا' بے شک تُو مسلمان مَرا ....!

لالۂ صحرائی

پیارا پاکستان

دنیا کو دہلائے اس کا اعلانِ تکبیر　　سورج کو شرمائے اس کے مقصد کی تنویر
مِلّت کو گرمائے اس کی آن کی یہ تصویر　　نیچا کرتا ہے سرِ باطل، اُونچا پاکستان

اُجلا پاکستان _____ پیارا پاکستان

رَب کی مشیّت اس کے تحفّظ اور بقا کی ضامن　　بھرا رہے گا تا بہ قیامت اس کی عمر کا دامن
اہلِ دنیا! دیکھنا مِٹ جائیں گے اس کے دشمن　　مِلّتِ مُسلم کو خالق کا تحفہ، پاکستان

اُجلا پاکستان _____ پیارا پاکستان

تیرا گرچہ اس پر چلتے ہیں غیروں کے ہر پَل　　گِرے یہ دشمن کے قدموں پر، آنہیں سکتا کبھی وہ کل
فضلِ رَبّ سے یہی نکالے گا اعداء کے کَس بَل　　آہنی پیکر میں اللہ نے ڈھالا پاکستان

اُجلا پاکستان _____ پیارا پاکستان

اس کے دریاؤں میں پانی بحرِ بطحا[1] و طَیبہ[2] کا　　اس کی فضاؤں پہ خیمہ زن ہے دینِ پیغمبرؐ کا سایہ
گُھلا ہُوا ہے اس کی ہَوا میں رَب کی رحمت کا چرچا　　دینِ حق کی شوکت کا ہے قریہ[3] پاکستان

اُجلا پاکستان _____ پیارا پاکستان

اس کے عسکری[4] اس کے بازو، سیسے کی دیوار　　دائرہ ہے یہ مرکزِ دیں کا ہم اس کی پرکار[5]
طَیبہ میں جو خُلد نشیں ہیں، وہ اس کے سرکارؐ　　ہر شہری کے سَر کا سہرا پیارا پاکستان

اُجلا پاکستان _____ پیارا پاکستان

1۔ مکہ مکرمہ　2۔ مدینہ منورہ　3۔ بستی　4۔ سپاہ پاکستان　5۔ دائرہ کھینچنے کا اوزار

مضامین

حسنین نواز

اقبالؒ اور عقل و عشق

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

سکونِ قلب و نظر جب عقل و خرد کی وسیع دنیا میں بھی نہ مل سکا تو اقبال اس کی تلاش میں جا نکلے۔ کوچۂ عشق میں جا نکلے۔ کوچہ عشق میں انہیں نہ صرف سکونِ قلب و نظر مل گیا بلکہ وہ رازِ حیات کے اصل مقصود بھی پا گئے۔

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

عقل و عشق کے موضوع پر اقبال نے بہت کچھ کہا ہے۔ انہوں نے عقل کو راہِ منزل اور عشق کو منزل سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال کی نگاہ میں عقل نے انسان کو وہ شعور دیا جس کے ذریعے وہ جہل و نادانی پر غالب آیا۔ انسان کی حکیمانہ بلند نظریں اور فلسفیانہ تدبر عقل و خرد کی عطا ہے۔

خرد نے مجھ کو عطا کی نظرِ حکیمانہ

عقل کی رہنمائی میں انسان آستانِ مقصود کے قریب پہنچ جاتا ہے اس کا پانا اور اس کی حقیقت سے آشنائی یہ عقل کا نہ تو کام ہے اور نہ اس کی حدِ مقدور۔ عقل کا کام محض امتیازِ سود و زیاں اور تسخیرِ عالم ہے۔ تسخیرِ فطرت کے لئے اقبال نے جس ارفع و اعلیٰ قوت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ عشق ہے۔

عشق کیا ہے؟ جو عقدے عقل حل نہ کر سکی عشق نے وہ گتھیاں کیسے سلجھائیں؟ ان دونوں سوالوں کا جواب عشق کو عقل سے بلند ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ عشق وہ عظیم ترین قوت ہے جو تحت الثریٰ سے سدرۃ المنتہیٰ کی نا قابلِ فہم وسعتوں کو ایک جست میں طے کر سکتی ہے۔ یہ محبت کے طوفانی سمندر کی سب سے اونچی موج ہے۔ عشق سراپا خلوص اور عقیدت ہے۔

عشق بیچارہ نہ ملا نہ زاہد نہ حکیم

عشق سوز و گداز کا سب سے لطیف مگر بلند نغمہ ہے جو منزل تک پہنچنے کے لئے مادی اور جسمانی واسطوں کا ہرگز بھی محتاج نہیں۔ عشق روحانیت کی برقی لہروں کے دوش اپنی منزل و مقصود تک اڑان کرتا ہے۔ یہ لہریں وہ خود اپنی تاثیر سے تخلیق کرتا ہے۔ خواہش جب شدید ہو جاتی ہے تو وہ ان دیکھی اور نامحسوس لہروں کا رخ دھار لیتی ہے۔ یہ لہریں فضا کو چھیڑے بغیر مقصود تک پہنچ جاتی ہیں۔ دل کا پیغام دل تک یہی لہریں لے جاتی ہیں۔ یہ لہریں دل کو دل سے راہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ عمل خالص روحانی فعل ہوتا ہے۔ اس میں معشوق خواہ حقیقی ہو یا مجازی عشق کی پرواز کا طریقہ کار وہی ہوتا ہے۔

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل

عشق جنون کے ارجن کا گرجتا ہوا نالہ ہے۔ جنون و طاقت

ہے جو جادۂ حقیقت اور منزل مقصود رکھتی ہے۔خرد جب منزل مقصود کو نہ پا سکی تو اقبال بے تابانہ جنون کے تمنائی ہو گئے' یہیں پر انہوں نے خرد کے مقابلے میں جنون کی برتری کو نہ صرف تسلیم کر لیا بلکہ انتہائی عاجزی سے اس کی بھیک مانگی۔

عقل کیا ہے؟ ۔۔۔انسان کو فطرت کی طرف سے بخشا گیا وہ شعور جس کے بل بوتے پر وہ دوسری مخلوقات پر اعزاز وفضیلت اور شرف پاتا ہے۔ خدا کا دیا ہوا وہ فہم و ادراک جو حیوان ناطق کے ذہن کندۂ نا تراش کو دہشت و بربریت کے جاہلانہ اوصاف سے پاک رکھتا ہے اور حیوان ناطق' حیوان سے ممیّز وممتاز ہو کر انسان کہلاتا ہے۔عقل' انسان کو ہر قسم کے دنیاوی علوم و معارف سے حد کمال تک بہرہ یاب رکھتی ہے وہ سماجی' اقتصادی' مدنی اور سیاسی زندگی میں عقل کے طفیل آئے دن ترقی کرتا ہے۔عقل کے طفیل ایک طرف وہ فضائے بسیط کر رہا ہے وہ دوسری طرف انسانی دل کے کامیاب آپریشن کر رہا ہے۔

عقل کے بل بوتے پر انسان ستاروں کی نا قابلِ فہم مہمات طے کر رہا ہے۔ جب نفسِ امارہ انسان کو گمراہ کرتا ہے تو اکثر و بیشتر صرف پاسبانِ عقل اس کو راستے پر لاتا ہے۔ابوالہوسی جب انسان کو اندھا کر دیتی ہے تو عقل اس کی چشمِ بصیرت کو بیدار کرتی ہے جس پر وہ کھوٹے کھرے کی پہچان کے قابل ہو جاتا ہے۔اقبال کے نزدیک نورِ عقل سے چشمِ بصیرت جِلا پاتی ہے اور راہگیر کی نظریں علم و آگہی کا شعور پا کر منزل کے خطرات کو دیکھ لیتی ہے۔خرد کیا ہے؟ چراغِ راہگذر ہے۔تاہم وہ مقام آ جاتا ہے جب عقل زمین و آسمان کی بے حد و حساب وسعت میں کھو کر عجز کا اظہار کر دیتی ہے۔ارض و سما کی بے کراں وسعت عقل کے ادراک سے بلاشبہ بہت بالاتر ہے اس کو عبور کرنا عقل و خرد کے بس کا روگ نہیں ہو سکتا۔اس مقام پر عشق کی ایک جست سے یہ فاصلہ طے پا جاتا ہے۔

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

عشق کی رہنمائی میں سرورِ کونین ایک ہی لمحہ میں عرشِ بریں پر جا پہنچے تھے۔ معراج شریف کا واقعہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ فضا جن رفعتوں میں عقل صدیوں کے سفر کے بعد ابھی تک منزل آشنا نہیں ہے عشق نے صدیوں پہلے ایک ہی جست میں یہ فاصلے اور فضائیں سمیٹ ڈالی تھیں۔ اقبال نے عشق اور عقل کی معزوری پر ایک دوسرے تاریخی بحران کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

القصہ جس جگہ عقل کی انتہا ہوتی ہے وہاں سے عشق کی ابتدا ہوتی ہے۔اقبال عشق کو نورِ حیات کہتے ہیں اور نارِ حیات سمجھتے ہیں۔

عشق کے مضراب سے نغمہ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

ایک مردِ کامل بننے کیلئے سوزِ عشق ضروری ہے۔عشق ہی وہ زینہ ہے جو سرفرازی کے آسمان تک پہنچا سکتا ہے۔اس سے مردِ خدا حیاتِ ابدی پاتا ہے۔جس کو علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم مسجد قرطبہ میں یوں بیان کیا ہے۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اُس پر حرام

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ اپنے چچا ابولہب کو پیغامِ حق سنایا مگر اس نے ہر بار عقیدتِ حق کو اپنی بڑائی کے زعم میں جھٹلا دیا۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب خدا نے پیغامِ حق بندوں تک پہنچانے کی ذمہ داری دی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلا حیل و حجت اسے تسلیم کر لیا۔ تسلیم و رضا کا یہی جذبہ عشق ہے۔ دوسری جانب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا نے اپنے آپ کو اپنے بھتیجے پر افضل سمجھا اور اسی غور و خوض سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کی قیمت اس کی نگاہ میں کم ہوگئی اور اس نے پیغامِ رسالت ٹھکرا دیا' یہی غور و خوض عقل ہے۔ اسی پر اقبال نے کہا ہے۔

عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب

عقل انسان کے ذہن میں جنم لیتی ہے انسان فانی ہے اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن ختم ہو جاتا ہے۔ عشق کا تعلق روح سے ہے۔ روح ابد سے ازل تک ہے۔ ازل اور ابد کا درمیانی فاصلہ جاودانی ہے۔ اس لئے عشق ابدی اور زندہ جاوید ہے۔

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسان ہے فانی زندہ جاوید عشق

اس طرح عشق ان چیزوں میں کارفرما ہے جو فنا کی لذّت سے تا ابد نا آشنا رہتی ہیں جو جاوداں کہلاتی ہیں۔ جس طرح صراحی بغیر شراب کے بے قدر و قیمت بعینہٖ زمانہ عشق کے بغیر بے معنی ہے۔ عشق سورج کی روح اور چاند کی رگوں میں بہنے والے خون کی مانند ہے۔

شیشۂ دہر میں مانندِ ناب ہے عشق
روح خورشید ہے، خونِ رگ مہتاب ہے عشق

اقبال نے عشق کو خدا کا کلام اور اس کا رسول کہا ہے

عشق دمِ جبرائیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

القصہ اقبال کی نظر میں عقل اتنی ہی فانی اور کوتاہ پرواز ہے۔ جتنا انسانی جسم اور عشق اتنا ہی بلند پرواز اور جاوداں ہے جتنی کہ روح۔ انسان عشق و عقل کا ایک امتزاج ہے زندگی کی طویل مسافت میں حالات و زمانہ کے ساتھ ساتھ اسے ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنانا پڑتا ہے' کبھی عقل کا عصاء تھامنا پڑتا ہے تو کبھی بے خطر ہو کر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے۔

ایک دعا

یا اللہ
کھانے کو روٹی دے
پہننے کو کپڑا دے
رہنے کو مکان دے
عزت اور آسودگی کی زندگی دے
میاں یہ بھی کوئی مانگنے کی چیزیں ہیں؟
کچھ اور مانگا کر'
بابا جی آپ کیا مانگتے ہیں؟
میں؟
میں یہ چیزیں نہیں مانگتا
میں تو کہتا ہوں
اللہ میاں' مجھے ایمان دے
نیک عمل کی توفیق دے
بابا جی آپ ٹھیک دعا مانگتے ہیں
انسان وہی چیزیں تو مانگتا ہے
جو اس کے پاس نہیں ہوتیں

_____ (ابنِ انشاء)

فرحت زمان

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

میں ایک اندھیری گلی کے وسط میں ایک قدیم گھر کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں دیکھتی ہوں ہندو اپنے ہاتھوں سے نفرت، ظلم و تشدد کے شعلے بلند کرتے آ رہے ہیں، میرا دل اُن کی درندگی کا نشانہ بنتے اور تلواروں کی ان گنت مسلسل ضرب کھاتے ایک انسان کو دیکھ کر دہل گیا جو کہ یقیناً ایک مسلمان ہے اور ان سے مذہب میں تضاد رکھنے کی سزا، اُس کے لہولہان وجود کو دیکھ کر اپنے خطا ہوتے اوسان اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ذہن کے ساتھ میں اُس گھر میں داخل ہوتی ہوں جہاں ایک ہال نما کمرے میں چند سہمی عورتیں، بچے اور کچھ مرد ہیں۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ ایک خاندان کے نہیں ہیں۔ اپنے کانپتے وجود کے ساتھ میں برآمدے کے فرش پر بہتے خون سے نظریں چراتی ہوں تو وہ سامنے لٹکے کیلنڈر پر جا پڑتی ہیں جو 1947ء کا سال رقم کر رہا ہے۔ اچانک کچھ لوگ کمرے میں داخل ہوتے ہیں، اپنے ہاتھوں میں تلواریں لئے ان لوگوں پر دھاوا بولتے ہیں مگر یہ مرد جوان بہت بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ میں حیرت و رشک کی تصویر بنے اُن جانباز سپاہیوں کو مقابلہ کرتے دیکھ رہی ہوں ان کے جانے تک کافی دلیر شہادت کا رتبہ پا چکے ہیں۔ ایک ننھی جان بھی اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ اُس کی زندگی کی شمع۔۔۔ بس پل بھر میں گل ہونے والی ہے۔ اُس کی ماں کی دل دہلاتی التجائیں آس پاس کے پہلے ہی زخموں سے چور دلوں کو مزید چیر رہی ہے مگر میری سوچ تو ایک نقطے پر مرکوز ہے کہ یہ بہادر جوان کیوں انجان لوگوں کے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال رہے ہیں جب کہ کچھ اس نعمت کو کھو بھی چکے ہیں۔ شاید اُن میں سے ایک بزرگ میرے ذہن کو پڑھ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

> ''یہ مسلمان ہیں اسلام کے محافظ، جذبہء ایمانی سے سرشار، اللہ کے نیک بندے جو اللہ کی مخلوق سے ہمدردی اور اُن کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔''

میں ڈری، سہمی، خاموشی و سکوت کی تصویر بنی، خوف و ہراس کی وادیوں میں گھوم رہی ہوں کہ اچانک کہیں سے ہندو آ جاتے ہیں۔ میں لوگوں سے مدد کے لئے چیخ و پکار کرتی ہوں کہ اچانک میں بھی کسی تلوار کا نشانہ بن جاتی ہوں۔ میں رونا چاہتی ہوں مگر رو نہیں پاتی۔ میں نے زور سے چلّانا چاہا مگر آواز کہیں حلق میں ہی جا کر پھنس گئی اور پھر۔۔۔۔۔۔ میری آنکھ کھل گئی اور میری چیخ سن کر میرے والدین میرے پاس آ گئے۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے، لیکن میرے پاس اُن کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں کہاں تھی؟ میں وہاں کیا کر رہی تھی؟ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور کانپ رہا تھا۔ مکمل طور پر جاگ جانے کے بعد بھی میں اپنے اردگرد وہی آہ و بکا سن سکتی تھی۔ جب میں جاگی تو صبح کے چھ بج رہے تھے۔ آٹھ بجے میرے والد نے خبریں سننے کے لئے ٹیلی ویژن چلایا تو پہلی خبر ایک ہی گھر میں سات افراد کے قتل ہونے کی تھی دوسری خبر ایک ریل گاڑی کے دھماکہ سے تباہ ہونے کی تھی۔ وہاں پڑی لاشیں اور خون

ویسا ہی تھا جیسا میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ میرے ذہن نے لاشعوری طور پر اس حادثے کا خواب سے موازنہ شروع کر دیا میں نے سوچا کہ وہ لوگ کتنے خوش قسمت تھے کہ دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے لیکن یہ بد قسمت لوگ تو اپنے ہی ملک کے شدت پسندوں کا نشانہ بن گئے۔ میں نے اُن بہادروں کا ان بزدلوں سے مقابلہ کیا' جن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر یہ مسلمان ہیں' ایک ہی اللہ کو ماننے والے ایک ہی کتاب کے پیروکار اور ایک ہی نبی کی امت ہیں تو نظریات و عمل کا یہ تضاد کیسا؟ ایک وہ وقت تھا کہ دیارِ غیر میں مسلمانوں نے ہماری حفاظت کی اور آج یہ وقت ہے کہ اپنے ہی ملک میں' اپنے ہی گھر میں' اپنے ہی لوگوں سے ہمیں حفاظت کی ضرورت ہے؟

کیا ہم وہی ہیں؟ ہماری انسانیت کہاں گئی۔ انسان کی تخلیق کا مقصد یہی ہے کہ ایک انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لئے محبت ہو اگر ایک انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لئے محبت نہیں تو انسانوں کا یہ معاشرہ حیوانوں کا ایسا مجموعہ ہے جس پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

معاشرے اور افراد کا باہمی تعلق حقوق و فرائض کی مساوی تقسیم پر مبنی ہوتا ہے۔ ان حقوق و فرائض اور سماجی عقائد پر عمل پیرا نہ ہونا معاشرتی برائیوں کے پھیلاؤ کا سبب بنتا ہے۔ ایسی ہی ایک معاشرتی بیماری جو بالخصوص ہمارے ملک اور انسانیت کے لئے بالعموم ایک ناسور کی شکل اختیار کر چکی ہے' وہ ہے دہشت گردی۔

آج کیفیت یہ ہے کہ اغوا' ڈکیتی' بم دھماکے اور قتل و غارت معاشرے کا طرۂ امتیاز بن گئے ہیں۔ جنگ و جدل کا بازار گرم ہے خون پانی سے بھی سستا نظر آتا ہے۔ دل بے حس ہوتے جا رہے ہیں مرد' عورتیں' بچے غرض سب ہی اس بدامنی کا لقمہ بن رہے ہیں کوئی بھی تو محفوظ نہیں۔

ان وارداتوں نے انسانوں کو اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے اور افسوس صد افسوس مسلمانوں کو دنیا بھی اس کا ذمہ دار قرار دے رہی ہے لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو غیر مسلموں کی اسلام دشمنی کا ثبوت ہے۔ ہمارے چند نادان مسلمان بھائیوں نے نادانستگی میں اپنی پہچان بنالی ہے۔ اے کاش کہ وہ عقل و فہم اور جرأت و حوصلہ مندی سے کام لیں۔ آپؐ نے طاقت کی بجائے بھائی چارے کی بنیاد پر 23 سال کے عرصے میں ایک مکمل ضابطۂ حیات پیش کیا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ آج ہر طرف بم دھماکوں کا دور دورہ کیوں ہے؟ لاشوں کے انبار ہماری آنکھوں کے سامنے سے کیوں نہیں ہٹتے؟ برستی ہوئی گولیاں امن مقاصد اور ارادوں کو چکنا چور کیوں کر رہی ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو اسلحہ ہمارے دشمنوں کے خلاف استعمال ہوتا تھا' وہ ہم نے اپنے بھائیوں پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہم نے اپنی سوچ بدل لی اور پھر منزل بھی بدل گئی۔ یہی یکجہتی آج کے مسلمانوں کے لیے لازم ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

ہمیں اپنے دین' ایمان اور اپنے وطن اور اپنے اس گھر کی لاج رکھنا ہوگی۔ اس پودے کی حفاظت کرنا ہوگی جس کو ہمارے بڑوں نے اتنی محنت سے سینچا ہے۔ ہم نے واپس وہی رویہ' وہی سوچ' وہی عمل اپنانا ہے۔ انشاءاللہ ہم نے بدلنا ہے' اپنے آباء کی قربانیاں کب تک ہمارے اعمال کی سیاہی دھوتی رہیں گی۔

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے
تھے تو آباء وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

مرزا انس بن سیف

اعضائے حِسّیات

آنکھ

آنکھ دیکھتی ہے مگر آج کل کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ لب پہ آ سکتا نہیں آنکھ کا جس قدر ذکر شاعروں کے ہاں ملتا ہے اتنا ڈاکٹروں کے ہاں ملتا تو آنکھ کا علاج اس قدر مہنگا نہ ہوتا۔ آنکھ کا ایک اور استعمال محاوروں میں ہے۔ آنکھوں سے محض آنسو ٹپک سکتے ہیں۔ مگر اتنے سے کہاں گزارہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آنکھوں سے مستی، شراب، شرارت وغیرہ بھی ٹپکانا پڑی، تب کہیں جا کر گزارہ ہوا۔ آنکھیں برستی بھی ہیں اور بہتی بھی ہیں۔ آنکھ لڑتی بھی ہے اور غلط جگہ لڑ جائے تو بہت لوگ لڑ پڑتے ہیں۔ آنکھ نہ ہوتی تو اندھوں میں کانا راجہ کیسے چنا جاتا، ہمارے ملک کا سارا نظام دھرے کا دھرا رہ جاتا۔

آنکھ کو دل کا راستہ بھی کہتے ہیں۔ یہ بات ڈاکٹروں سے مخفی ہے، اگر اندازہ ہو پائے تو دل کے آپریشن کے لئے خواہ مخواہ چیر پھاڑ نہ کرنا پڑے۔ یہاں حکومت آنکھوں کا تارا ہوتی ہے، جن کے خیالات مختلف ہوں انہیں دن میں تارے دکھائے جاتے ہیں۔ تب جا کر بینائی اور خیالات درست ہوتے ہیں۔

ناک

یہ نہ ہو تو رونے رلانے والے شاعر اور ادیب نہایت لغو باتیں کریں۔ جن الفاظ پر ان کا تکیہ ہے وہ سب ناک سے منسلک ہو کر با اثر ہیں جیسے الم ناک، اندوہ ناک، ہولناک، دردناک وغیرہ وغیرہ

کئی لوگ ناک کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ سارے جسم پر مکھیاں بھنبھناتی رہیں تو کوئی پرواہ نہیں کرتے، مگر جیسے ہی ناک پر بیٹھنے لگیں فوراً اڑا دیتے ہیں، اسی طرح میڈیا بھی کرتا ہے، جس مسئلے میں مصالحہ نہ ہو اس کی بات تک نہیں کرتا۔

بعض اوقات ناک بلند ہونا شروع ہو جاتی ہے، مجبوراً منہ ساتھ جڑا رکھنے کے لئے خود کو بھی بلند کرنا پڑتا ہے۔ پھر عوام بندے سے خود پوچھتی ہے، بتا تیری رضا کیا ہے۔ ایسا اکثر نئی نئی امارت یا غیر متوقع افسری میں ہوتا ہے۔ ناک کو سیدھ بتانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر کوئی دوسروں کو بتاتا ہے مگر خود کوئی سیدھا نہیں چلتا۔

ناک کا راستہ کدھر کو جاتا ہے، یہ صرف نمرود نے ہی دریافت کیا تھا، اور اس کے ساتھ وہی ہوا جو ہمارے ہاں سائنسدانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

کان

یہ واحد عضو ہے جو دیواریں بھی رکھتی ہیں، مگر وہ سن کر کیا کرتی ہیں، یہ عقدہ کیسے کھلے، زبان تو ان کی ہوتی نہیں۔ چاہے جو مرضی کہتے رہو چپ چپیتی سن لیتی ہیں۔

ایسی خاصیتیں بہت سے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ انہیں کچھ بھی کہو

بے نیازی سے سن لیتے ہیں' ذرا عمل نہیں کرتے۔ ایسے لوگ سرکاری دفاتر میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

پہلے پہل کانوں پر اکثر جوئیں رینگتی رہتی تھیں' لیکن آج کل صفائی کا ایسا اعلیٰ انتظام ہے کہ اگر آپ صفائی سے ہاتھ نہیں ملائیں گے تو کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگے گی۔

دونوں کان اگر بیچ سے ملے ہوں تو بہت فائدہ ہوتا ہے' ادھر کی اُدھر سے نکل جاتی ہے' اس کام کے لئے بہت محنت درکار ہے۔ تبھی تو کتنے سالوں بعد کہیں جا کر کرسی ملتی ہے۔

زبان

زبان سے نکلی ہوئی بات اور کمان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس نہیں آتے۔ یہ پرانی کہاوت ہے۔ ہم چونکہ روشن خیال قوم ہیں' ایسی قدامت پسندی ہمیں گوارہ نہیں۔ چنانچہ جدت کے تقاضوں کے مطابق آج کل زبان سے محض تیر نکلتے ہیں اور کمان کے پیچھے بیٹھے لوگ زبانی کلامی کام چلاتے ہیں۔ پہلے صرف جانوروں کی زبان لمبی ہوا کرتی تھی' جو اشرف المخلوقات کی توہین تھی۔ مگر اب انسانوں کی زبان بھی بہت لمبی ہوگئی ہے۔ جس کی زبان جس قدر لمبی ہوگی وہ اتنی ہی بار الیکشن جیتتا جائے گا۔

کسی زمانے میں لمبی زبان رکھنے والے لوگوں کو ہتک آمیز ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ان کی اب بہت عزت ہے' انہیں آج کل فنکار کہا جاتا ہے۔ اور یہ اکثر ٹی وی شوز کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں کرنے کو بات بھی بہت کم ہوتی تھی' کیونکہ بات میں وزن اور منطق کی موجودگی جیسی احمقانہ شرطیں بھی تھیں۔ اب ایسی کوئی پابندی نہیں۔ بس آپ کے پاس یا تو مائیک ہونا چاہیئے یا گھنٹہ پیکج۔

پہلے تولو پھر بولو۔ کتنے احمق تھے پرانے لوگ' اب بندہ ہر وقت ترازو تو ساتھ رکھنے سے رہا۔

زبان کی وجہ سے لوگ کرسی پا لیتے ہیں' رکے ہوئے کام نکل جاتے ہیں' اگلے الیکشن کے لئے وعدے کر لیتے ہیں' چندے اکٹھے کر لیتے ہیں۔ ترقیاں حاصل کرتے ہیں' مقام پاتے ہیں' بینک بیلنس بناتے ہیں۔ اگر تولنے کے جھنجھٹ میں پڑے رہتے تو یہ سب ہو پاتا؟ پرانے لوگ زبان سے نہیں پھرتے تھے۔ آج کل تو ایمان سے پھر جاتے ہیں۔

ہاتھ

ہاتھ چھونے اور محسوس کرنے کے لئے ہے۔

نوٹ گننے اور چیک کاٹنے میں بھی ہاتھ ہی استعمال ہوتا ہے۔ ہاتھ بند ہو تو مٹھی بنتی ہے۔ اور مٹھی گرم ہو تو راستے کھل جاتے ہیں۔ اور مٹھی گرم نہ کرے تو آدمی ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔

ہاتھ پھیلایا بھی جاتا ہے' اسے عُرفِ عام میں فارن پالیسی کہتے ہیں۔ سکندر جب گیا تو خالی ہاتھ تھا' اس کے زمانے میں سوئس بینک جو نہ تھے۔

قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں' پہلے مجرم کی پہچان کے لئے اس کے اعمال دیکھنے پڑتے تھے' یہ طریقہ لمبا اور دِقت طلب تھا۔ اب محض ہاتھ ملا کر پتا چل جاتا ہے کہ ہتھکڑی پہنانی ہے یا سلام کرنا ہے۔

پہلے چوروں کے ہاتھ کاٹے جاتے تھے' لیکن اس میں ملک کی بدنامی تھی' بیرونی وفد ملاقات کے لئے آتے اور یہاں استقبال کے لئے آئے لوگوں میں کسی کا ہاتھ ہی نہ ہوتا۔ نہ کوئی پارلیمنٹ میں ڈیسک بجا سکتا' نہ سرکاری دفاتر میں کوئی کام ہو پاتا' غرض ملک کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

حسن مسعود

ادھار

آج نقد کل ادھار
ادھار محبت کی قینچی ہے
ادھار مانگ کر شرمندہ نہ ہوں
ادھار کشمیر کی آزادی تک بند ہے

ایسے فقرے آپ نے کئی دکانوں اور ٹھیلوں پر پڑھے ہوں گے۔ باوجود اتنی تنبیہ اور نصوح کے بھائی لوگ اس فعل سے باز نہیں آتے۔ بعض اوقات تو ہمیں حیرانی ہوتی ہے کہ اتنا ادھار دینے کے باوجود دکاندار حضرات نفع کیسے کماتے ہیں؟

جب ہم نے اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ انہوں نے ادھار لینا کب اور کیسے شروع کیا ہے تو وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولے:

''آج بھی اس وقت کو یاد کرتا ہوں جب میں ادھار سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے سودا سلف خریدنے کے بعد جیب میں ہاتھ ڈالا تو بٹوا ندارد۔ مجھ پہ یہ سنگین انکشاف ہوا کہ کوئی جیب تراش مجھے میری جمع پونجی سے محروم کر گیا ہے۔ دکاندار جو اس صورتحال کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے۔ بڑی خوش اخلاقی سے فرمانے لگے۔

ارے جناب کوئی بات نہیں اگر ابھی پیسے نہیں ہیں تو بعد میں دے دیجئے گا۔' آخر آپ ہمارے معزز گاہک ہیں'۔ یہ پہلا فقرہ تھا جس نے مجھے ادھار کی لعنت کا قائل کیا۔ اس کے بعد کچھ یوں ہوا کہ اکثر و بیشتر میں ادھار میں سودا لینے لگا۔ کچھ عرصہ تو دکاندار بہت خوش اخلاقی سے ملا' مگر پھر اس کے تیور بدلنے لگے۔ چنانچہ میں نے دوسری دکان کا رخ کیا اور آج یہ حال ہے کہ بمطابق

ع - چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

اسی طرح ادھار چھوڑنا میرے لئے ممکن نہیں رہا۔ یار ذرا اپنا موبائل دینا میں گھر والوں کو بتا دوں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں''۔

خیر یہ بتانا ہم ضروری نہیں سمجھتے کہ جب اس نے موبائل ہمیں واپس کیا تو اس میں بھی 15 روپے کا ادھار لے چکا تھا۔

ادھار کی وباء صرف خریداری تک محدود نہیں بلکہ اس کے ذیل میں ہر چیز آتی ہے۔ سوئی سے لے کر جہاز تک۔ ہر چیز ادھار لی جا سکتی ہے اور بچہ ہو بوڑھا یا جوان سب ادھار لینے کی یکساں قابلیت رکھتے ہیں۔ اس میں رنگ' نسل یا ذات کی کوئی قید نہیں۔ آپ جو بھی ہیں جیسے بھی ہیں ادھار مانگنا آپ کا حق ہے۔

ادھار مانگنے کے چمپئن طلباء ہیں' پن پنسل' کاپی سے لے کر نوٹس اور کتابیں ہر چیز ادھار لی جا سکتی ہے۔ بعض اوقات تو ایک ہی بال پین سے کئی طلباء کلاس میں نوٹس بناتے ہیں۔ اور ایک ہی طالب علم کے نوٹس پوری کلاس میں چلتے ہیں۔ یہی معاملہ اسائنمنٹ کا ہے' اسائنمنٹ کا سارا نظام ہی ادھار پر چلتا ہے۔ اگر اسائنمنٹ کا ادھار دینا ختم ہو جائے تو چھاپے کا

تصور ہی ختم ہو جائے۔

ادھار میں روزمرہ کی اشیاء اور ذرائع آمدورفت بھی شامل ہیں۔

ہمارے ایک عزیز دوست ملک صاحب ہیں ان کے پاس ایک بائیک ہے جسے وہ ادھار دینے میں بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی صدر کے کسی بینک جانا ہو یا ہاسٹل سے کوئی چیز لانی' ہو سب کی نظر ملک کی بائیک پر ہی پڑتی ہے۔ بس انہیں ایک رول پر اٹھا کھلایئے اور بائیک آپ کی ہوئی۔ البتہ نئی خبر یہ ہے کہ کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر بائیک کا ادھار بند کر دیا گیا ہے۔ امید ہے بھائی لوگ جلد ہی اس وجہ کا ازالہ کر لیں گے اور بائیک پھر سے برائے ادھار مہیّا ہو گی۔

ادھار صرف انفرادی نہیں بلکہ یورپی ممالک بھی اس دوڑ میں شامل ہیں اس کی زندہ مثال ہمارا ملک ہے جو اس قدر ادھار لے چکا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ مقروض ہوتا ہے۔ خیر ملکی سطح پر بحث کے لئے تو کئی دانشور موجود ہیں لیکن انفرادی زندگی میں ادھار کے کئی فائدے بھی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اگر کسی سے تعلقات خراب کرنے ہوں تو اس سے ادھار لے لیا جائے اور اگر کسی سے دوبارہ نہ ملنا ہو تو اسے ادھار دے دیا جائے۔ اگر آپ ادھار لینے کے شوقین ہیں تو یہ خیال رکھیں کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور اگر ادھار دینے کے شوقین ہیں تو دیوالیہ ہونے کے لئے تیار رہئے۔ اپنا وقت دینے کا شکریہ۔

اویس عزیز

زندگی

یہ اس دن کی بات ہے جب میرا سامنا زندگی کے اس حصے سے ہوا' جو اپنی حالت' رنگت اور دکھ کو اپنے چہرے پر سجائے ہوئے اس امید میں تھا کہ شاید میں اسی لائق ہوں یا میرے ساتھ میرا رب خوش نہیں۔

ایک ایسا قطرہ آنکھوں میں رکھے ہوئے جو کب سے آزادی کا طلب گار ہو اور ایک ایسی وحشت چہرے پر موجود جو عمر کا ایک بہت بڑا حصہ گزار کر ادھر تک پہنچی ہے۔ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں بہت سوچتا ہے اور اس کو حسین اور خوبصورت بنانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس کا مستقبل اس کے ساتھ ہے کہ نہیں۔

یہ کچھ ماہ پہلے کی بات ہے جب میرا گزر ایک ایسی جگہ سے ہوا جس کے بارے میں' میں نے اپنی بیس سال کی عمر میں صرف سنا تھا لیکن آج وہ دن تھا کہ میں اس کو حقیقت کا روپ دے سکا۔ جب میں اس پرانی حویلی نما عمارت میں داخل ہوا تو میری روح نے ایک بار مجھے جھنجھلایا اور روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنے قدم نہیں روکے۔ جب میں اس عمارت کے اندر داخل ہوا تو میرا سامنا ایک ادھیڑ عمر شخص سے ہوا جس کی رنگت اور حلیہ اس کے بارے میں تقریباً سب کچھ بتانے میں کامیاب تھا۔ میں نے اس ادھیڑ عمر شخص سے سلام میں پہل کی اور انہوں نے بہت شائستگی اور پیار سے مجھے بیٹا کہتے ہوئے جواب دیا جس سے مجھے بہت زیادہ اپنائیت کا احساس ہوا اور مجھے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کا کہنے لگے اور میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ ان کا کمرہ کافی چھوٹا سا تھا اور اسی طرح کے اور کمرے بھی اس عمارت میں موجود تھے۔

سیّدہ فوزیہ

''صاحبِ حال''لوگ

کوئی کہتا ہے نہیں ہے' کوئی کہتا ہے کہ ہے
کیا خبر' ہے یا نہیں ہے' تیری دنیا کا وجود!

اکثر یہ سُننے میں آتا ہے کہ وہ شخص بڑا صاحبِ حال ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نہ تو ماضی کی یاد میں مبتلا رہتا ہے اور نہ ہی مستقبل سے خوفزدہ ہے۔ جو اس کو مل رہا ہے وہ اسی پر شکرِ نعمت بجالا رہا ہے۔ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں کی کہ ہم حال میں زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ یا تو ماضی میں رہتے ہیں یا پھر مستقبل کی تلاش میں سرگرداں۔ جو لذّتیں اللہ نے حال پر عطا کی ہوتی ہیں اُن سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

یہ بڑا ہی آسان اور بیک وقت مشکل کام ہے۔ ہمارے سمیت دنیا بھر کی تربیت ہی ایسے ہوتی ہے لیکن صاحبِ حال نہایت عقلمند شخص ہوتا ہے کیوں کہ اُسے جیسا' جتنا اور جو ملتا ہے وہ اُسی سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور خوش رہتا ہے۔ اور اسی کیفیّت کو حالِ مستی کہتے ہیں۔

دانشوروں کا قول ہے کہ جو حال میں جنتی ہے مستقبل میں بھی وہی جنتی ہوگا۔ کیونکہ اُس کا حال ہی مستقبل بننے والا ہے اور جو حال میں جتنا مشکل میں مبتلا ہوگا' مستقبل میں بھی اتنا ہی ہوگا۔ آپ اپنا حال خراب کر کے دیکھ لیں آپ کا مستقبل لامحالہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔

دراصل مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم اپنے مستقبل سے اتنے خوفزدہ ہو جاتے ہیں کہ اپنے حال سمیت زندگی برباد کر لیتے ہیں۔ پہلے زمانے کی بات ہے کہ ایک بادشاہ اپنے وزیر سے ناراض ہوگیا اور اُسے پھانسی کی سزا سُنا دی لیکن بادشاہ کا دستور تھا کہ وہ پھانسی سے پہلے قیدی کی آخری خواہش ضرور معلوم کرتا۔ جب وزیر سے اس بابت سوال کیا گیا تو وہ کہنے لگا بادشاہ سلامت! مجھے ایک سال کی رہائی عطا کریں اور اس کے بعد بے شک پھانسی دے دیں۔ تھوڑی سوچ وچار کے بعد بادشاہ راضی ہوگیا۔ اب جب وزیر گھر پہنچا تو اس کی بیوی بہت حیران ہوئی لیکن جب وزیر نے اُسے سارا واقعہ سُنایا تو وہ رونے لگی اور کہنے لگی کہ ایک سال تو فوراً ختم ہو جائے گا اور پھر وہی وقت آ جائے گا اس سے تو بہتر تھا کہ تمہیں آج ہی پھانسی ہو جاتی۔ وزیر نے اُسے بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانی اور یونہی روتی رہی۔ خیر وقت گزرتا رہا اور کچھ عرصے کے بعد وزیر اور اُس کی بیوی دونوں مر گئے۔

اب نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ بھی ہوسکتا ہے اور آدمی اپنے حال کو برباد کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ دراصل یہ چند باتیں ہوتی ہیں جو انسان کو ڈراتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ کوئی وجود نہیں رکھتیں حالانکہ وہ ذات جس سے ڈرنا چاہیے وہ ذات تو صرف اللہ کی ہے اور وہی اللہ اپنے بندوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

''اور میری عبادت کرو' اور مجھ ہی سے مدد مانگو''

اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے کاندھوں پر اتنا ہی بوجھ لادیں جتنا کہ ہم اٹھا سکتے ہیں' اور اپنے حال کو خوب سے خوب تر بنائیں تا کہ خوش وخرم رہ سکیں۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

محمد احمد

تبدیلی کا آغاز ـــــ اپنی ذات سے

ہم اپنے کردار کو چھوٹا یا حقیر نہ سمجھیں کیونکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان کے پیچھے کوئی معمولی کوشش یا کردار نظر آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت کا آغاز کیا تو اپنے گھر سے کیا اور اس سے بھی بہت پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی غارِ حرا میں جاتے تھے اور معاشرے کی ابتر صورتحال اور کچھ بہتری لانے کے حوالے سے متعلق سوچتے رہتے تھے۔۔۔اس کی تو خود سائنس میں کئی روایات موجود ہیں کہ زیادہ تر Innovations and Inventions کے پیچھے کوئی معمولی سی سوچ یا کوشش کارفرما تھی' Newtonian Physics or Archimedes Principle' مصر کا انقلاب ایک مصری نوجوان کے ہاتھوں فیس بک پر صدر حسنی مبارک کے خلاف پیج بنا کر ہوا' افریقہ کے ریلوے ٹی ٹی کی بدتمیزی نے بیرسٹر گاندھی کو آگے چل کر مہاتما گاندھی بنا دیا۔۔۔ الغرض ہماری inputs کبھی رائیگاں نہیں جاتی' روزانہ باقاعدگی سے پتھر پر گرتا ہوا قطرہ بھی بالآخر اس میں سوراخ کر دیتا ہے ہم تو پھر بھی انسان ہیں اور بہت سی صفات و کمالات کے مالک بھی لہٰذا ہمیں اپنی ذات سے تبدیلی کا آغاز کرنا چاہئے اور بڑے نہ سہی چھوٹے ہی سہی لیکن مقاصد اور ترجیحات ضرور وضع کرنی چاہئیں جو صرف اپنی ذات تک محدود نہ ہوں کہ ان کا دائرہ کار سبجیکٹ معاشرہ ہو۔ ہاں مطلوبہ نتائج ملنے میں دیر ہو سکتی ہے لیکن قدرت اپنے اصول سے انحراف نہیں کرتی۔

کتاب پڑھنا اور اپنے خیالات کو کاغذ پر منتقل کرتے رہنا میں سمجھتا ہوں ہمیں بہت ساری چیزوں سے بہرہ مند کرتی ہے اس سے ہمارے خیالات میں فراست اور سنجیدگی آتی ہے اور سوچ کو الفاظ کا جامہ پہنائے بغیر ہمیں بھی معلوم نہیں ہوگا کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں اور کیا سوچنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی سوچ، خیالات اور مقاصد کو کاغذ پر منتقل کرتے رہنا چاہیئے۔ کہ جن لوگوں نے بڑے اور عظیم لوگوں کی سوانح عمری پر بہت لکھا یا پڑھا ہے وہ اپنے مستقبل کے بارے میں نوجوانوں کو ایک Mission Statement بنانے کی بھی تجویز دیتے ہیں۔

اس موضوع پر لکھنے کیلئے میں نے کچھ لٹریچر پڑھا تا کہ جان سکوں کہ لوگ اپنے تجربات کی روشنی میں کیا تجاویز پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں Seven Habits of Highly Effective Teens by نے Sean Covey کو کافی متاثر کن اور قابل عمل پایا ہے، وہ لکھتا ہے کہ نوجوانوں کو یہ عادات اپنانی چاہئیں:

1. اپنے آپ کو اپنی زندگی کا ذمہ دار سمجھنا اور اس کیلئے Proactive رہنا اور فعال کردار ادا کرنے کیلئے اصولوں کی بنیاد پر خود Initiative لینا۔ اس طرح کے لوگ Agent of change یا تبدیلی کے علمبردار ہوتے ہیں اور وہ بصورت دیگر دوسروں کو کسی غلطی کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے۔ وہ ہر تبدیلی کا آغاز اپنی ذات سے شروع کرتے ہیں اور پھر باہر کی دنیا کیلئے قابل تقلید نمونہ بن جاتے ہیں۔

2. اپنے مقاصد اور اہداف کے بارے میں آگہی ہونا؛ اس طرح کے لوگ

visionary ہوتے ہیں اور انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی منزل تک پہنچنے کیلئے کس طرح تگ و دو کریں گے اور یہ کہ انہیں کسی دوسرے کے سہارے نہیں بلکہ خود ان منازل کو طے کرنا ہے۔ یہ لوگ اپنی اقدار، اصول وقوانین، تعلقات، مقاصد و اہداف سے مکمل طور پر committed اور غیر متزلزل ہوتے ہیں۔

3. اپنی ترجیحات متعین کرنا؛ سب سے اہم چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دینا اور اسے اسی لحاظ سے تیار کرنا، یہ وہ عادت ہے جو بعد میں وقت کو مورِدِالزام ٹھہرانے کی عادت سے آدمی کو نجات دیتی ہے۔

4. جیت اور سب کی جیت؛ باہمی اشتراکِ عمل اور آپس میں احترام کے جذبات کو فروغ دینا اور سب کو ساتھ لے کر چلنا، خود غرضی اور selfishness نہ ہو، یہ عادت انسان کو لفظ ''میں'' کے بجائے ''ہم'' سکھلاتی ہے اور ٹیم ورک کی صورت میں Conflict resolution میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ علم، اتھارٹی، عزت وشہرت، ریوارڈ اور خوشی و غم کی آپس میں شیئرنگ کا دوسرا نام ہے۔

5. زیادہ سننا اور کم بولنا؛ اللہ تعالی نے ہر انسان کو دو کان اور ایک زبان دی ہے اس لئے پہلے سننا سمجھنا اور پھر بولنا اور سننے کی برداشت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ دوسرے کو سمجھنے کی غرض سے سننا نہ کہ صرف اسے جواب دینے کی غرض سے، سمجھنے کی کوشش ایک رحمدلی کے جذبے کو اور سمجھانے یا سمجھے جانے کی کوشش انسان کے خود اعتمادی کے جذبے کو فروغ دیتی ہے لیکن اصل تاثیر اور کامیابی دونوں کی باہمی برابری اور توازن کے حصول میں ہے۔

6. اتحاد اور باہمی اشتراک؛ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں، دو دماغوں کا آپس میں مل کر کام کرنا تیسرے متبادل کا ضرور راستہ بتلاتا ہے، کامیاب خاندان اور آرگنائزیشنز کا راز انفرادی قوتوں کے آپس میں اسی باہمی رابطے اور تعاون میں پنہاں ہے۔

7. تجدید اور تعمیرِ نو: وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو روحانی، جسمانی و طبعی، معاشرتی و جذباتی اور دماغی طور پر تازہ کرتے رہنا، یہ وہ عادت ہے جو انسان کو بقیہ تمام اچھی عادات واقدار کو اپنانے کیلئے پیشِ خیمہ ثابت ہوتی ہے اور اس پر آمادہ کرتی ہے۔

متوازن خوراک

کسی بادشاہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک طبیب بھیجا کہ ضرورت کے وقت آپؐ کی جماعت کا علاج معالجہ کیا کرے۔ طبیب مدتوں مدینے میں حاضر رہا مگر کسی شخص نے اس سے علاج کے لیے رجوع نہ کیا۔ حکیم نے یہ مسلسل بے کاری دیکھ کر آخر ایک دن آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ ''حضور جانتے ہیں کہ خاکسار اتنی مدت سے صرف آپؐ کے جان نثاروں کی خدمت کے لیے حاضر ہے مگر اس عرصے میں میری طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''ان لوگوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب تک بھوک غالب نہ ہو، کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے اور ابھی پیٹ بھرتا نہیں کہ ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ اس لیے آپ کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ملتا ہے۔'' حکیم نے کہا ''بے شک! تندرستی کا یہی اصلی راز ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے میری حاضری بے کار ہے۔'' اس کے بعد حکیم نے آداب بجالا کر وطن کی راہ لی۔

(شیخ سعدی) _____

ادیبہ رحمٰن

''دوئی''

مالکِ کائنات نے جب انسان کی تخلیق کی تو اُس وقت اُس کی روح ہر گناہ سے پاک تھی۔ انسان اِس قدر ہلکا تھا کہ ہوا اُڑا لے جائے۔ ایسا وجود کہ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی' جو اپنے اچھے بُرے سے بے خبر تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اور اُس گمنام کے جسم پر ماس آنے لگتا ہے تو وہ اپنی پہچان کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اپنے نفع نقصان سے آشنا ہو جاتا ہے اور اپنی راہیں متعین کرنے لگتا ہے۔

وہ انسان جو پہلے خود چل بھی نہیں سکتا تھا اَب اُسنے ایسی چال پکڑی ہے کہ اُسے اپنے سِوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کی دُھن میں لگ جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ میں اس مقام پر کِس کے توسط سے پہنچا اور کتنی منزلیں پار کرنے کے بعد میں اس قابل ہوا۔

اِس بے جان پُتلے کو جو پر لگنے لگے ہیں تو وہ اپنی حقیقت کو بھول کر دوسری دنیا میں قدم جمانے لگا ہے۔ جیسے جیسے وقت کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے یہ انسان اپنی دُھن میں گم ہوتا جاتا ہے۔ اِس ہوس میں گم یہ لالچی دُنیا کی بہت سی تلخ حقیقتوں سے بھی ہم کلام ہوتا ہے اور اس سفر میں بہت سے مختلف سوچ کے لوگوں سے ملتا ہے۔ یہ لوگ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں لیکن میں اُس انسان کی خاص طور پر کہانی بتا رہی ہوں جِسے دنیا کو پانا ہے اور سب کو ہرا کر خود کو بلندی پر پہنچانا ہے۔ ایسی بلندی کہ جس پر اُس کی اَنا کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے۔

جدوجہد کی یہ گاڑی سفر میں ہے اور یہ ہوس کا مارا گلی گلی گھومتا پھرتا ہے۔ اِس انسان کی سب سے جُدا اور بے نظیر خوبی اس کا دوغلا پن ہے۔ نجانے یہ منزل پر پہنچے یا نہ پہنچے پر ایک بات بہت واضح ہے کہ اس نے اپنی آخرت خراب کر لی ہے۔ وہ اس لئے کہ جب یہ لوگوں سے ملتا ہے تو اُس لمحے دِکھانے کو مُسکراتا ہے اور دل میں سوائے کھوٹ کے کچھ نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہے کہ اس کامیابی کو پانے کے لئے دو چہرے رکھنے ضروری ہیں۔ کیوں وہ یہ سمجھتا ہے کہ دُنیا کی فتح ہی دائمی فتح ہے۔

میرے ناقص خیال اور اللہ کے الفاظ کی روح سے ایک اُخروی فتح بھی ہے اور وہ پانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کا اندر اور باہر یعنی ظاہر اور باطن ایک سا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئلے پر سفید چونا کر دیا ہو' ایسا نہ ہو کہ خزاں نے بہار کا لباس اوڑھ رکھا ہو۔ بندے کا مَن اور اس کی زبان کا ایک سا ہونا ضروری ہے۔ نہیں تو پھر وہ بندہ یہ بات ذہن نشین کر لے کہ آخرت کا نتیجہ باطن سے دیئے گئے جوابات کے مطابق ہوگا اور اگر باطن ہی کالا ہوا تو پھر گورے ظاہر کا کوئی نفع نہ ہوگا۔

خدا جانے کیوں ہم نے اپنی اصلیت کو چھوڑ کر اوروں کے ظاہر کو اپنے وجود کا حصہ سمجھ لیا ہے جو ہم ہیں نہیں وہ کیوں بن کر دِکھاتے ہیں اور جو

ہمارے لئے ہے نہیں ہم کیوں اُس کو حاصل کرنے میں گم ہو جاتے ہیں۔ کیوں ہم اس حقیر سی دُنیا کی فتح کے لئے خود کو گرا دیتے ہیں۔ کیوں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم یہاں پر مہمان ہیں اور مہمان بھی وہ کہ جس کے پاس وقت بہت کم اور کام بہت زیادہ ہے۔ چاہے مہمان کو پتہ ہو نہ ہو اُس کا حقیقی مالک اُس کے انتظار میں ہے۔

جب بندے کو معلوم ہے کہ سدا بہار نہیں رہتی' سدا سویرا نہیں رہتا' سدا یہ زندگی نہیں رہتی اور اُس دنیا کی زندگی کے میلے سدا نہیں رہتے تو پھر کیوں یہ بھول گیا ہے کہ واپس بھی جانا ہے۔ پھر کیوں دل میں کدورتیں' آنکھوں میں نفرت اور زبان پر شعلے رکھے ہیں۔ کیا کسی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنا' کسی کا دُکھ بانٹنا کوئی معنی نہیں رکھتا؟ اس دنیا کے پجاری کو ان سب کاموں میں کوئی ذہنی سکون اور اطمینان نہیں ملتا ہے!!!

پھر آخر کار اِس کی جمع کردہ پونجی میں جو آئے گا اس کا گِلہ نہ کرے۔ پھر یہ نہ کہے کہ میں نے تو دنیا میں فلاں فلاں ایوارڈ لیئے تھے۔ وہاں دائمی زندگی میں نیتوں کا حساب ہوگا۔ یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اپنے دل کی خوشی اور اپنے من کی خواہشیں کتنی پوری کیں بلکہ یہ سوال ہوگا کہ اے بندے جو کمایا کس نیت سے کمایا؟ اپنے رب کی خوشی کے لیے یا اپنی خوشی کے لیے؟

فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے اب بھی اگر ہم اپنے اس دوغلے پن سے باز آ جائیں تو ہماری آخرت سنور سکتی ہے پر اس کے لیے آخرت پر اور آخرت میں ملنے والے انعامات پر ایمان ہونا ضروری ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جب رحمٰن نے کہہ دیا کہ یہ سب ثمر میں اپنے بندے کو انعام میں دوں گا تو مسلمان یہ سمجھ جائے کہ ہاں یہ سب انشاءاللہ ملے گا۔ خدا جانے دو چہرے رکھنے والے انسان کا انجام کیسا ہوگا۔ امید ہے کہ شاید وہ بدل جائے اور اپنی آخرت سنوار لے شاید! اپنے اس شعر کے ساتھ ''دوئی'' کا اختتام کرتی ہوں اور دعا گو ہوں کہ خدا ہمیں اپنی رضا کے مطابق کر دے (آمین)

تیرا یہ چہرے بدلنا تیری پشیمانی نہ بن جائے
ظاہر و باطن میں یکسوئی رکھ کہ زندگی بن جائے

''جب تک''

زندگی تاریکی ہے' سوا اُس وقت کے جب لگن ہوتی ہے اور ہر لگن اس وقت تک اندھی ہوتی ہے جب تک علم نہیں ہوتا اور ہر قسم کا علم اس وقت تک بیکار ہے جب تک عمل نہ ہو اور عمل کھوکھلا ہے جب تک محبت نہ ہو اور جب تم محبت کے ساتھ عمل کرتے ہو' تب تم خود کو اپنے آپ سے' ایک دوسرے سے اور خدا سے باندھ لیتے ہو۔

_____(خلیل جبران)

میری ماں جھوٹ بولتی تھی

8 سالہ بچے کی ماں فوت ہوگئی اُس کے باپ نے دوسری شادی کر لی' ایک دن باپ نے اُس سے پوچھا:

تمہیں پہلی والی ماں اور نئی والی ماں میں کیا فرق لگا

بیٹا معصومیت سے: پہلے والی ماں جھوٹی تھی اور نئی والی سچی

باپ حیرانگی سے: بیٹا وہ کیسے؟

بیٹا: جب میں پہلے شرارت کرتا تھا تو ماں کہتی تھی کہ اگر تُو شرارتوں سے باز نہ آیا تو تُجھے کھانا نہیں دوں گی' میں پھر بھی شرارتیں کرتا اور وہ مجھے پورے گاؤں سے ڈھونڈھ کر لے آتی اور کھانا کھلاتی لیکن اب جب میں شرارت کرتا ہوں تو نئی والی ماں کہتی ہے کہ اگر شرارت کی تو کھانا نہیں دوں گی' آج دو دن ہوگئے میں بھوکا ہوں۔

غزلیات

محمد عثمان اختر

غزل

دل پہ حالت خمار کی سی ہے
صورت ان کی بہار کی سی ہے

ان سے کہنا عذاب کا سا ہے
عادت ان کی قہار کی سی ہے

خلق کہتی ہے اب مجھے مجنوں
بات سچی، شرار کی سی ہے

کر دیں ساری دعائیں رَد اپنی
خلقِ گُل بے قرار کی سی ہے

ابر آئے تو جھومے صحرا بھی
تشنگی دل میں خار کی سی ہے

اپنی تنظیم اس طور کیجئے کہ کسی پر بھروسہ کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ یہی آپ کا واحد اور بہترین تحفظ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کسی کے خلاف بدخواہی یا عناد رکھیں۔ اپنے حقوق اور مفاد کے تحفظ کے لئے وہ طاقت پیدا کر لیجئے کہ آپ اپنی مدافعت کر سکیں۔

(قائدِ اعظمؒ کا فرمان۔ اجلاس مسلم لیگ، لاہور 23 مارچ 1940)

عزیر اللّٰہ

غزل

دلِ مضطر کی کہانی کا بیاں کیسے کروں
شام کی بکھری اداسی کا بیاں کیسے کروں

طوفاں لازم ہے کہ جب خامشی گھیرا کر لے
دلِ رنجور کی چُپ کو میں زباں کیسے کروں

گیسو الجھے ہیں ، پریشانیاں ہیں آنکھوں میں
تیری ناساز طبیعت کو نہاں کیسے کروں

ثا قبِ فرش نہ بن ، جا کے چمک گردوں پہ
ثا قبِ عرش کی گردش کا بیاں کیسے کروں

تیرے چہرے کی چمک کیسے تجھے دکھلاوں
گزرے لمحات کی خوشیوں کو جواں کیسے کروں

کر توکّل ، تو ہے آسان ہر اک چیز' عزیز
اتنی سی بات کو مشہورِ جہاں کیسے کروں

یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے' صرف حفاظت کے لیے اٹھے گی۔ لیکن فی الحال جو سب سے ضروری امر ہے وہ تعلیم ہے۔ علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے' جایئے اور علم حاصل کیجئے۔

(قائداعظمؒ کا فرمان۔ اجلاس بلوچستان مسلم لیگ کوئٹہ۔ 03 جولائی 1943)

محمد صہیب اکرم

غزل

ہر صبح ہوتا ہے تیرا اک انداز نیا
کر کے رہتا ہے مسخر میرا ذہن، نقش و نگار نیا

لپیٹ کر میری عقلِ کل، میری دنیا، میرا جہاں
محو رکھتا ہے اپنے آپ میں مجھ کو، یہ جہاں نیا

قلب گرفتار تیرے جلال میں شام و سحر
کرتا ہے کیسا ظلم شیریں یہ آواز یہ ساز نیا

تیری یادوں میں گم، میرا دن میری راتیں
دل ویران، شہر برباد، کیسا ہے یہ طوفاں نیا؟

تلاش ہے مجھ کو میری ذات، میرے وجود کی صہیب
فنا کرتا ہے اپنے آپ میں مجھ کو، کیسا یہ مہربان نیا

ہمارے دشمنوں نے پاکستان کو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ کر مار دینے کی کئی طریقے سے کوششیں کیں اور ان تمام کوششوں میں ناکام و مایوس ہو کر انہوں نے سمجھا کہ معاشی سازشوں سے وہ مقصد با آسانی حاصل ہو جائے گا جو ان کے دل کے قریب ہے۔ انہوں نے پیشگوئی کی کہ پاکستان بہت جلد دیوالیہ ہو جائے گا اور یوں دشمنوں کی تلوار اور بھڑکائی ہوئی آگ جو مقصد حاصل نہ کر سکی وہ مملکت کے بگڑے ہوئے اور تباہ شدہ مالی حالات سے بخوبی حاصل ہو جائے گا۔ لیکن ان کے جھوٹے نجومیوں کو زبردست مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ ہمارا پہلا بجٹ ہی ''اللہ تعالیٰ'' کے فضل و کرم سے فاضل بجٹ ہے۔ تجارت کا توازن ہمارے حق میں ہے اور معاشی میدان کے ہر شعبے میں ترقی صاف نظر آتی ہے۔

(قائداعظمؒ کا فرمان۔ پاکستان کی پہلی سالگرہ۔ 14 اگست 1948)

کنول شاھین

غزل

خود ساختگی ستم کا اب حساب لیا جائے
یہ ضروری نہیں کہ ہر بار ہر لفظ سہا جائے

بتا چکے بہت ظلم کدوں میں شب و روز
اب اٹھو کہ جنونِ عشق اجاگر کیا جائے

تضادِ گفتار، کمزوریٔ کردار کیونکر
چلو کہ ہر نفس کے نفس کو مغلوب کیا جائے

چھوڑ کے کسی کرشمے کی امید کسی سراب کی تلاش
کیا نہیں ممکن کہ قطرہ قطرہ دریا کیا جائے

بے اعتنا زندگی مانندِ شام ڈھلتی جائے
پھر کیوں نہ خود کو مانندِ خورشید جلایا جائے

یہ خاموشی، یہ مایوسی خون جلاتی ہے میرا
ہے وقت اب، کھا کے طمانچے موج کے، گہر بنا جائے

بہت دے دیئے سبق دانشمندی کے
کیوں نہ کنول، اب کچھ اپنے بارے میں سوچا جائے

ادیبہ رحمٰن

غزل

ہر بے وفا سے وفا کی ہم نے
یوں زندگی اپنی فنا کی ہم نے

قربان کیا جس پر سب کچھ اپنا
وہ بھی کہتا ہے جفا کی ہم نے

صحرا کر گیا جو میرے گلستان کو
فقط اُس کو بھی دُعا دی ہم نے

میری آنکھوں کو سدا کی نمی دے گیا
جِس کی ہر تلخ بات بُھلا دی ہم نے

اُس نے ہی قیمت لگا دی میرے دل کی
زندگی جس کی بھی انمول بنا دی ہم نے

بھول گیا وہ ہمیں گھر کے پتے کی طرح
زندگی جس کی تلاش میں گنوا دی ہم نے

ہم سے زیادہ وہ اوروں سے رہا مخلص
جس کی بھی اہمیت بڑھا دی ہم نے

مگن رہے وہ اپنے میلوں میں
اُن کی یاد سے آس لگالی ہم نے

حاصل یہ ہوا اِس جنگ سے عدی
ٹھنڈی ریت میں آگ لگا دی ہم نے

اسد طارق

غزل

حال گزرتا رہا حال گزرتے گزرتے
منزلِ عشق محال گزرتے گزرتے

زندگی کا امتحان رہا دشوار اس قدر
جواب فراموش ہوئے سوال گزرتے گزرتے

دمک رہی ہے لبوں پر کہ رکھ کے گیا
مسکان جو ایک خیال گزرتے گزرتے

وجود تیرا پھیلا ہوا مشرق سے مغرب
کبھی جنوب سے شمال گزرتے گزرتے

حسن تیرا جو دیکھا تو خدا کی قدرت ہے
رہ گیا دل پہ وبال گزرتے گزرتے

جلاتا رہا پلک سے گرا آنسو مجھے
دھیمے سے بروئے گال گزرتے گزرتے

شبِ تنہائی میں اسد ڈوبے رہے ایسے
عمر گزر گئی میری' سال گزرتے گزرتے

میں آپ کو مصروفِ عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں کام کام اور بس کام۔ سکون کی خاطر' صبر و برداشت اور انکساری کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جائیں۔

(قائداعظمؒ بموقع آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹ کانفرنس' جالندھر۔15 نومبر 1942)

وسیم خان

غزل

سناؤں غمِ دل کی داستاں کیسے
بنے میرا دل میری زباں کیسے

عشق سے پہلے اور عشق کے بعد
دیکھیے بدلتا ہے انساں کیسے

خاک ہو جائیں گے دل میں لیے
پورے ہوں یہ ارماں کیسے

منبر پہ واعظ تھا میرا ساقیِ آشنا
مجھ سے پوچھا تم یہاں کیسے

صورتِ یار نگاہ سے اتری نہ ہو
تو آئینہِ دل پہ بنے نشاں کیسے

افشائے رازِ عشق ہونا تھا آخر
چھپائے تیرے ذکر کو رازداں کیسے

وعدہ کر کے نہ آئے تو خوب ہوا
انہیں دل میں بٹھاتا میزباں کیسے

ذکرِ فرہاد کیوں ہو پسِ مرگِ وسیم
کہ نثار کیجئے یار پہ جاں کیسے

خان حسان محمد

غزل

دل میں وحشتیں یہ دستک ہے دے رہی
پھر یوں ہواکے وصل کی عادت نہیں رہی

کچھ زندگی حسین تھی، موسم بہار تھا
پھر یوں ہوا کہ جینے کی حسرت نہیں رہی

چلتا تھا جام دیر تلک اس کے شہر میں
پھر شہر کو بھی شور سے الفت نہیں رہی

موسم دیوانگی کا اور صحرا کا ہو سفر
پھر اس سفر سے دل کوبھی نفرت نہیں رہی

وہ پوچھتا رہا ہے رستہ تیری گلی کا
پھر پوچھنے میں پہلی سی شدت نہیں رہی

اک موسم فراق ہو اور دل ہو مضطرب
پھر اضطراب شوق میں لذت نہیں رہی

اِک وعدۂ وفا ‘ہے جو وفا ہی نہ ہوسکا
پھر اس سوختہ جان سے شکایت نہیں رہی

تیرے فراق میں ہم، اور ساون کا یوں مچلنا
پھر ہم کو اس ادا سے بھی عداوت نہیں رہی

ذیشان مبارک

غزل

در پہ کیوں منجمد ہے یہ منزل خیال کی
کیسی ہے کیفیت میرے شوقِ وصال کی

دیکھوں تجھے یا پھر کوئی تدبیرِ جاں کروں؟
حجاب کریا پوچھ لے قیمت قتال کی

خدارا کیا کہوں کل آخرِ شب کیا جنوں چھپایا
وگرنہ بزم تیری تھی نہ میری مَہ ہلال کی

کس کس کو سنے گا؟ بڑے ناصح ہیں میسر
تھا کیا بُرا جو دل نے کی جرأت سوال کی

اب ڈوب کے ابھر رہا ہے پھر نہ ملے گا
کچھ تو خبر لو عاشقِ دیوانہ حال کی

حکومت کا پہلا فریضہ امن و امان برقرار رکھنا ہے' تا کہ مملکت کی جانب سے عوام کو ان کی زندگی املاک اور مذہبی اعتقادات کے تحفظ کی پوری پوری ضمانت حاصل ہو۔

(قائداعظم محمد علی جناحؒ)

محمد عثمان اختر

غزل

دل لگی ہے حرکتِ دل کے سنور جانے کا نام
نامہ بر ہے، خط میں جو لکھا ہے، پھیلانے کا نام

محفلِ اغیار میں تو خوب بے پردہ رہے
کیوں نہیں خلوت میں لیتے زلف بکھرانے کا نام؟

پہلے تو اپنی زبوں حالی کا یہ عالم تھا کہ
لوگ میرے نام پہ رکھتے تھے ویرانے کا نام

آج کل منہ کو لگا رکھی ہے جو شیوخ نے
مفت میں بدنام کر ڈالا ہے میخانے کا نام

تم گئے جو روٹھ کر تو چرخ بھی رُوٹھا رہا
ابر نے بھی نہ لیا گردوں پہ چھا جانے کا نام

اک نظر تیری، مسیحائی زمانے کی کرلے
اک نظر ہے بادۂ و صہبا کے پیمانے کا نام

ان سے ملنے کی کوئی صورت نہ پیدا ہوسکی
نہ لیا حالات نے ہی کچھ بدل جانے کا نام

میں ہوں اختر روشنی کا رہ نما ٹھہرا ہوں میں
آپ اچھا سی کوئی بھی رکھ لیں دیوانے کا نام

عتیق الرحمٰن

غزل

تمہیں اپنوں میں دیکھنا' پراؤں میں دیکھنا
دن کی روشنی میں' شام کی فضاؤں میں دیکھنا

کبھی تجھے کعبے میں جا کر پوجنا تو کبھی
در بدر پھرنا' مٹی کے خداؤں میں دیکھنا

مجھ سے ترکِ تعلق کو وبالِ جان کیوں بنا بیٹھے
مجھے سجدوں میں سوچنا' اپنی دعاؤں میں دیکھنا

جب سجدوں میں نہ ملوں اور دعائیں بے اثر لگیں
پھر سانسوں میں ڈھونڈنا' وفاؤں میں دیکھنا

عتیق گر مشکل لگے میرا لوٹ کے آنا
ان سے کہو اپنی روح' اپنی اداؤں میں دیکھنا

اگر مسلمانوں کو اپنے عزائم اور مقاصد میں ناکامی ہوگی تو مسلمانوں ہی کی دغابازی کے باعث ہوگی۔ جیسا کہ گزشتہ زمانے میں ہو چکا ہے۔ میں دغابازوں کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتا لیکن ہر انصاف پسند اور سچے مسلمان سے میری درخواست ہے کہ اپنی جماعت کی فلاح و بہبود کی غرض سے متحد و متفق ہو کر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر آ کر اس کے پرچم کے نیچے کام شروع کر دے۔

(قائداعظمؒ کا فرمان۔ سندھ مسلم لیگ کانفرنس' کراچی۔ 19 اکتوبر 1938)

اسد طارق

غزل

اسی اک کشمکش میں ہیں مگن یہ آسماں، دھرتی
محبت رُوٹھ جائے تو محبت کیا نہیں کرتی

زباں کا کیا بھروسہ ہے کہ یہ تیرے ہی بس میں ہے
ہم سنبھل بھی جاتے اگر تیری نظر نہ مکرتی

کرو گھائل مجھے کہ موت سے میں نزدیک ہو جاؤں
کہ میرا جسم مرتا ہے لیکن روح نہیں مرتی

فقط دھواں ہو جاتی ہے آندھی کے زور سے
لَو بے ضرر ہو کر بھی آندھی سے نہیں ڈرتی

حسد کرتے ہیں اسد اُس آئینے سے ہم
جس آئینے کو دیکھ کر ہے صورت وہ سنورتی

یہ حقیقت آج اظہر من الشّمس ہے کہ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا ہے اور وہ بھی کسی خونی جنگ کے بغیر، عملی طور پر امن کے ساتھ، اخلاقی اور ذہنی قوت کے بل پر اور قلم کی طاقت کی مدد سے جو تلوار کی طاقت سے کچھ کم نہیں ہے اور یوں ہم نے ثابت کر دکھایا ہے کہ ہم سچے اور ہمارا مقصد بھی سچا..... پاکستان اب ایک اٹل چیز ہے۔ اسے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں اس برِصغیر کے انتہائی پیچیدہ آئینی مسئلے کا باعزت، منصفانہ اور عملی حل قیامِ پاکستان کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

(قائداعظمؒ کا فرمان۔ نشری بیان۔ لاہور 30 اکتوبر 1940)

ادیبہ رحمٰن

غزل

نہ ہر کسی کو اپنا بنایا کر
نہ ٹوٹ کر کسی کو چاہا کر

کب ہر رستہ منزل کو جاتا ہے
نہ اجنبی کو رہنما بنایا کر

کم ہی ہوتے ہیں وفا کے قابل
یوں اپنی چاہت نہ ضائع کر

میری مان عقل سے دوستی کر لے
نہ دل کے ہاتھوں خود کو ستایا کر

یونہی کہتے ہیں تیرا دل رکھنے کو
سب کی باتوں میں نہ آیا کر

تیرے اپنے جو کہتے ہیں تجھے
کچھ تو اِن کی بھی مان جایا کر

کب تلک ٹوٹے گی آس تیری
نہ خود کو اِتنا آزمایا کر

کچھ تو ملامت ہو اپنے کیے پر
خود سے بھی کبھی تو روٹھ جایا کر

کس کے انتظار میں ہے کھڑی
گنواں کر خود کو نہ پایا کر

خیال میں ہو جب احساس ایسا
ستاروں کی بستی میں کھو جایا کر

جب بھی نادم ہو رات دِن سے
تحریر سے نہ عدی دل بہلایا کر

کنول شاہین

غزل

شورشِ زندگی میں کچھ یوں چکرا گئے
کہ کسی کے انتظار میں کسی سے ٹکرا گئے

ابھی تو آغازِ سفر تھا
کیوں مسافروں کے قدم لڑکھڑا گئے

نہ تھی جب تک آشنائی اِک بھرم تھا
جان کر اِک دوجے کو کیوں دل بھرا گئے

اس کے ملنے کا انتظار تھا' اسے پانے کی تھی جستجو
اسے اپنا ہوتے دیکھ کر ہم کیوں پچھتا گئے

یہ کچی محبت تھی یا تو اِک سراب تھا
ہم کیوں منزل کو دیکھ کر گھبرا گئے

مسلمان جھکنے کے لیے پیدا نہیں ہوا..... اگر اسے جھکانے کی کوشش کی گئی..... تو بابر بن جائے گا..... یہ ٹیپو سلطان کی صورت میں نمودار ہو گا..... یہ مر جائے گا..... لیکن محکومی قبول نہ کرے گا .....

(قائداعظمؒ بموقع مسلم لیگ کا اجلاس۔ کلکتہ 16 اپریل 1938)

افسانے

محمد عثمان اختر

قربانی

وہ کب سے یہاں کھڑے تھے وہ نہیں جانتے تھے مگر وہ اس وقت کچھ کرنا بھی نہیں چاہ رہے تھے۔ ایک عجب اضطراب انہیں گھیرے ہوئے تھا۔ ایسے جیسے کسی نے ان کے گول' موٹے اور چمکدار شیشوں والی عینک پر رنگ پھیر کر انہیں کچھ بھی دیکھنے سے محروم کر دیا تھا۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی کہ وہ یوں گُم سُم ہو جاتے... حتیٰ کہ ان کے پاس اب سب کچھ تھا۔ ایک سمجھ دار اور عقل مند بیوی' تین بیٹے اور تین بیٹیاں اور وہ بھی صالح اور فرمانبردار' گاڑی ایک سے ایک اچھی' مخلص رشتے دار' سعادت مند ملازمین... کیا نہ تھا؟ پھر یہ کشمکش کیسی تھی؟

وجہ یہ نہیں کہ انہیں معلوم نہ تھی۔ بس وہ تو کہیں دور دھکیل دیئے گئے تھے۔ ماضی کے ان صحراؤں میں جنہوں نے ان کی زندگی بنا دی' جنہوں نے انہیں غیر معمولی کامیابی غیر یقینی ترقی اور بے انتہا لذتوں سے آشنا کیا۔ انہیں خود سے ملا دیا... ورنہ کیا وہ ہمیشہ سے ہی ایسے تھے؟ بالکل بھی نہیں۔ جانے کیا کچھ انہوں نے پڑھ رکھا تھا' وہ گول' موٹے اور چمکدار شیشوں والی عینک کیا یونہی لگ گئی تھی؟ رات کے اندھیروں میں بھی وہ سارا وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے... بس سویرے آنکھ کھلتی تو پتہ لگ جاتا کہ سحر آ گئی۔ مگر آج وہ ان سحریوں کو بھلا رہے تھے' کہیں کھو گئے تھے۔

پھر بھی آج کچھ ایسا تو نہیں ہوا تھا کہ وہ یوں ہو گئے تھے۔ بس ایک' آشنا چہرہ ان سے ٹکرا گیا تھا اور کیا ہوا تھا؟ ہاں اتنا ضرور تھا کہ یہ چہرہ جب ان سے چالیس سال پہلے ٹکرایا تھا تو ان کی زندگی یکسر بدل گئی تھی' ان کا وجود نئی راہ پر گامزن ہوا تھا' ان کی نظروں میں ایک نئی چمک آ گئی تھی مگر بہت جلنے کے بعد' بہت سہنے کے بعد... سو تیر کھائے تب ان کی کمان بھری۔ خون صد ہزار انجم سے وہ ایک سحر بن کر ابھرے۔ پروفیسر احمد انصاری بنے جن کی روشنی سے ہزاروں گھر روشن ہوئے' سوکھی نہریں آبدار ہوئیں اور بہت سے جوان مشعل بنے۔ مگر آج کے واقعے نے انہیں چالیس سال پیچھے لا کھڑا کیا' وہاں جہاں سے یہاں تک آنے میں انہیں بہت صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں مگر وہ انہوں نے دانستہ اپنی قسمت میں لکھوا دی تھیں۔

یہ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے جب 65ء کی جنگ ہوئے تین دن گزر گئے تھے اور افراتفری کا عالم تھا۔ اور وقت وہ تھا کہ جب سورج جلد کو پگھلائے دیتا ہے۔ ایسے میں ایک تانگہ لاہور کے گرد و نواح میں چکر کھا رہا تھا۔ وہ بھی شہر سے گاؤں جا رہا تھا۔ حلیہ بھی شہری بابوؤں کا سا تھا۔ اور اپنی نظر میں تو وہ واقعی شہری بابو ہی تھا۔ جنگی حالات کا اس پر خاک اثر نہ ہوا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مگن تھا' کبھی تانگے سے لٹک جاتا' کبھی دونوں اطراف کے درمیان سمٹ کر بیٹھ جاتا' کبھی سامان ٹٹولنے لگتا کبھی ارد گرد کے حالات پر غور کرنے کی کوشش کرتا جس

میں ناکام رہتا۔اس وقت بھی وہ کوئی نوعمر نہ تھا' جب آخری بار گاؤں اماں کے پاس گیا تھا تو اماں نے اس سے کہا تھا کہ پچیسویں میں لگ گیا ہے اب تو کوئی لڑکی پسند کر کے اس سے شادی کر لے مگر وہ تو جیسے سن ہی نہیں رہا تھا اور یونہی واپس آ گیا۔

اب کے تانگہ چلتے چلتے دریائے راوی کے پاس کی پکی سڑک پر آ گیا۔ وہاں تانگہ تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک خوبصورت دوشیزہ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ تانگے پر سوار ہوئی۔اس کی خوبصورتی نے احمد کو بری طرح سے متاثر کیا۔ جب سے وہ تانگے پر سوار ہوئی تھی وہ تب سے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔مگر وہ اس سے قطعاً بے خبر تھی۔اب اس کی بے قراری بڑھ رہی تھی کہ کسی طرح وہ شہری بابو کو دیکھ لے مگر ناکامی مقدر رہی۔تانگہ کچھ دیر اور رکا رہا تو ایک کمسن لڑکا بھی تانگے میں اس کے ساتھ آ کر بیٹھ رہا۔تھوڑی دیر بعد تانگہ چلنے لگا۔اب تک اسے اپنے مقصد میں سرخروئی نہ ہوئی تھی۔

تانگہ آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہا تھا اور اس کی کوششیں بھی تیز تر ہو رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ سامان ٹٹولنے لگتا کہ شاید وہ اس کی طرف یوں ہی متوجہ ہو مگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔اسے بس اس کی ایک نظر چاہیے تھی' اس کے بعد سکون تھا مگر وہ سکون اسے کہاں آ رہا تھا۔اس کی بے چینی اس قدر بڑھ گئی کہ وہ ہاتھ زور زور سے مسلنے لگا۔اس کی یہ حرکت لڑکے نے دیکھ لی جس کی آنکھیں نہایت گول مٹول تھیں اور رنگت بالکل سفید جیسے آسمان سے کوئی فرشتہ اتارا گیا تھا۔

''آپ کوئی چیز کھو بیٹھے ہیں؟'' لڑکے نے معصومیت سے پوچھا۔نن...

نہیں...'۔احمد نے گھبراہٹ میں کہا۔''کیوں؟'''آپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنا سامان کھولتے ہیں... مجھے لگا شاید میں مدد کر سکتا ہوں۔'' لڑکے نے کہا۔تانگہ دائیں طرف مڑ گیا۔''نہیں وہ میں ضروری سامان حفاظتی طور پر دیکھ لیتا ہوں' سفر میں کام آتا ہے'' احمد نے جواب دیا۔لڑکا جواب سے متاثر ہوا۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟'' لڑکے نے پھر پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہا' پھر کچھ سوچ کر بولا۔''میں سکول میں پڑھاتا ہوں۔'' لڑکا جواب سے بہت متاثر ہوا اور رشک آمیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا مگر اس کی نظریں تو اسی دوشیزہ پر تھیں کہ شاید اب وہ یہ سن کر اس کو ایک نظر بخشے... آپ تو بہت نیکی کرتے ہیں''۔وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کا فخر ہو۔''کیا پڑھ رکھا ہے آپ نے؟'' اس نے پھر سوال کیا۔احمد خوش ہو گیا کہ ایک ذریعہ اس کے ہاتھ لگ گیا جس کے تحت وہ اس دوشیزہ کو متاثر کر سکتا تھا۔

''ایم اے انگلش''۔احمد نے جواب دیتے ہی پھر دوشیزہ کو دیکھا مگر وہ مسلسل اِدھر اُدھر مناظر دیکھ رہی تھی۔راستہ اب ایک کچے پل کی طرف جا رہا تھا۔لڑکے کی آنکھیں خوشی سے باہر آ گئیں' اس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک سچا محبِ وطن ہے۔

''میرے دادا ابا کہا کرتے تھے کہ پڑھا لکھا شخص بادشاہ ہے جس کے پاس ہر انسان کو دینے کے لئے بہت کچھ ہے۔آپ تو بہت پڑھے لکھے ہیں' عظیم بادشاہ ہیں آپ ۔ میرے ابا کو آپ ملتے تو وہ نہایت خوش ہوتے۔آخر کار ملک آپ ہی جیسے لوگوں نے تو آگے چلانا ہے۔اوپر سے

یہ جنگی حالات' ایسے مصائب میں ملک کو آپ جیسے محنتی اور ذہین جوانوں کی سخت ضرورت ہے... ''لڑکا احمد سے بہت متاثر تھا مگر احمد کو لڑکے کا نہیں کسی اور کا متاثر ہونا درکار تھا' وہ تو لڑکے کی باتیں بھی دھیان سے نہیں سن رہا تھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''۔لڑکے نے پوچھا۔

''احمد انصاری۔تمہارا؟''۔احمد نے بے دھیانی میں پوچھا۔

''اقدس''۔لڑکے نے بہت خوش ہوتے ہوئے بتایا جیسے وہ کسی بہت عظیم ہستی کو اپنا نام بتا رہا تھا۔''میں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا ہوں۔اور میرا عزم ہے کہ میں آپ کی طرح پڑھ کر ملک کی خدمت کروں گا۔''

لڑکے کے حوصلے نہایت بلند تھے۔مگر احمد اس کے حوصلوں سے بے نیاز تھا۔اس کی نگاہیں کہیں اور تھیں۔ایک بار اس نے پھر سامان ٹٹولنا چاہا اور پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔تانگہ ایک تنگ کچے پل سے گزر رہا تھا جو دریائے راوی عبور کرتا تھا۔

اس نے سامان کا منہ کھولا ہی تھا کہ یکدم ایک جھٹکا لگا اور چیخیں بلند ہوئیں۔گھبراہٹ میں اس نے بھی چیخ ماردی۔کچھ دیر کے شور وغل کے بعد جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تو اسے سب سمجھ میں آ گیا۔وہ تانگے کا نچلا حصہ ہاتھ میں دبائے ہوئے معلق تھا جو اس نے زود فہمی سے پکڑ لیا تھا۔گھوڑے کا پاؤں پھسل گیا تھا' ایک پہیہ کسی نہ کسی طرح پل میں اٹکا ہوا تھا اور عورتیں اوپر ہونے کے باعث کسی نہ کسی طرح پل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھیں اور اب چیخ و پکار کر رہی تھیں۔قیامت کا سماں تھا۔اب جو ادھر نظر دوڑائی تو اقدس دوسرا کونہ تھامے ہوا میں معلق تھا۔تانگہ چلانے والا دریا میں جا گرا تھا' ڈوب گیا یا بچ گیا! کچھ معلوم نہ تھا۔سامنے صرف موت نظر آ رہی تھی۔کچھ دیر بعد عورتوں کی آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں۔شاید وہ قریب سے لوگوں کو مدد کے لئے بلانے چلی گئی تھیں۔احمد اور اقدس رہ گئے۔دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے' دیکھنے کے انداز سے دونوں پر عیاں ہو چکا تھا کہ وہ تیر نہیں سکتے۔

کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔بچنے کی صرف ایک صورت دونوں کے سامنے تھی اور اس صورت سے صرف ایک ہی زندگی بچ سکتی تھی۔اس صورت کو دونوں سمجھ چکے تھے' اگر ان میں سے کوئی ایک ہاتھ چھوڑ دیتا ہے تو کم وزن کے باعث تانگہ خود بخود اوپر ہو جائے گا اور پل تک آسانی سے جا سکے گا' مگر دونوں ہی گونگے بنے رہے۔آخر کار احمد بولا۔

''یہاں دور تک کوئی آبادی نہیں۔ہمیں بچانے کوئی نہیں آئے گا۔ہمیں خود کچھ کرنا ہوگا''۔

''بچنے کی صرف ایک صورت ہم دونوں کے سامنے ہے۔''اقدس کھوئے سے لہجے میں بولا۔''سوال یہ ہے کہ ہم دونوں میں سے کس کی زندگی زیادہ اہم ہے... تو اس کا جواب بھی آساں ہے' آپ مشعلِ راہ ہیں' آپ کی زندگی سے بہت سی زندگیوں کو سنوارنا ہے۔ملک کو اس وقت آپ کی سخت ضرورت ہے۔میرے کچھ بننے میں ابھی بہت وقت ہے' ملک کی جو خدمت آپ کر رہے ہیں اور مزید کر سکتے ہیں' وہ مجھ سے تکمیل پائی جانے کے لئے بہت برسوں دور ہے۔''

احمد دیوانہ وار چیخنے لگا اور اسے منع کرنے لگا مگر وہ باز نہ آ رہا تھا۔

''مجھے اس وطن سے شدید محبت ہے بلکہ عشق ہے۔یقیناً میری موت تاریخ

کے اوراق میں شہادت کے طور پر لکھی جائے گی۔''احمد کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا' اس جواں سال کی موت اپنی آنکھوں کے سامنے برداشت کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ وہ رو رہا تھا' چیخ رہا تھا' چلا رہا تھا کہ کوئی سبب نکل آئے اور دونوں بچ جائیں مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔'' اقدس نے اپنی گول گول موٹی آنکھیں میچ لیں اور منہ سے ''اللہ حافظ'' کہہ کر ہاتھ چھوڑ دیئے۔ احمد روتا رہا' چلاتا رہا مگر وہاں کوئی نہیں تھا جو اس کی آہ وفغاں سنتا۔ ایک شڑاپ کی آواز آئی' اقدس اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا اور احمد اپنی منزل کو... تانگہ اوپر آ چکا تھا وہ پل تک پہنچ چکا تھا۔

وہ دیوانہ وار رو رہا تھا' پاگلوں کی طرح اچھل رہا تھا... یکدم گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے اپنا سر تھام لیا' وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اچانک اسے خیال آیا وہ پل عبور کر کے دوسری طرف آیا اور نیچے جانے کا راستہ ڈھونڈھنے لگا مگر بے سود... وہ ایک سمت کو مایوس ہو کر چلنے لگا۔ اقدس کی چیخ وپکار کی بھی آواز نہ آئی' اللہ کی راہ میں اس نے چپ چاپ جان دے دی۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہے جا رہے تھے... جانے وہ عورتیں بھی واپس آئی تھیں کہ نہیں...

اس کی آنکھوں کے سامنے اقدس کا چہرہ گھوم رہا تھا' اس کا وہ معصوم چہرہ جس سے ملحق بدن نہایت پاک تھا' جس کے جذبات اور احساسات نہایت اقدس تھے۔ وہ روئے چلے جا رہا تھا' اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ ان چند لمحوں میں اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔ وہ سر جھکائے ایک پتھر پر بیٹھ گیا' اب اس نے تمام واقعے کا ایک بار پھر جائزہ لیا تو خود پر صدہا لعنتیں بھیجیں' دل چاہا کہ سر پتھر سے دے مارے' اقدس کی موت کی وجہ وہ ہی تو تھا' اقدس کی جان اس کے جھوٹ نے لے لی وہ جھوٹ جو اس نے اس دوشیزہ کو متاثر کرنے کے لئے بولا تھا' ایم اے انگلش؟ وہ تو میٹرک پاس تک نہیں تھا' اچکا تھا' شہر میں چھوٹی موٹی چوریاں کر کے اپنے شب وروز کاٹ رہا تھا' ایسے میں وہ ایک بیوی کا بوجھ اپنے سر کیسے لاد سکتا تھا۔ اماں کو یہی بتا رکھا تھا کہ شہر میں مزدوری کرتا ہوں... اور وطن کی محبت سے تو وہ بالکل بے غرض تھا۔ اسنے کب جانا تھا کہ حبِّ وطن کیا چیز ہے؟ اتحاد' اتفاق' ملی جذبات کن کیفیات کے نام ہیں... مگر آج اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اجزاء کس کُل کے ہیں' وہ جان گیا تھا کہ ایثار اور قربانی کسے کہتے ہیں' خلوص کس جذبے کا اور عشق کس کیفیت کا نام ہے' وہ ان سب سے آشنا ہو گیا تھا۔ ''یقیناً میری موت تاریخ کے اوراق میں شہادت کے طور پر لکھی جائے گی''۔ ان الفاظ نے اس کے اندر آگ بھر دی' اقدس تو اپنی جنت اپنے ساتھ لے گیا تھا' اب احمد کی باری تھی۔ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ' ایک نئے حوصلے اور ولولے سے سبک گام ہوا' بجائے گاؤں جانے کے اس نے شہر کی راہ لی۔ جن قابلیتوں کا دعویٰ اس نے اقدس کے سامنے کیا تھا ان کو پورا کرنے کی اس نے دل میں ٹھان لی۔

خدا کا نام لے کر سب سے پہلے اپنے تمام گناہوں کی معافی اس نے مانگی اور اس شدت پیاس سے سجدہ ریز ہوا کہ ہچکی بندھ گئی۔ اقدس کی موت کو قتل سے تعبیر کر کے خدا سے گڑگڑا کر اپنے جھوٹ کی تلافی چاہی۔

اس کے بعد اپنی اس راہ پر چلنے کی تیاری شروع کی جس کا اس نے عہد کیا تھا۔ چوری کے کچھ پیسے سے جو اس کے پاس کچھ دنوں سے پڑے تھے اس نے میٹرک کا داخلہ فارم خرید لیا اور گاؤں سے کسی بہانے اپنی کتابیں واپس لے آیا اور محنت شروع کر دی۔ وہ الفاظ جنہیں پڑھنے سے اس کا جی

گھبراتا تھا' ان میں آج اسے اپنی منزل منتظر نظر آ رہی تھی مگر زندگی گزارنے کے لئے اسے اب پیسوں کی ضرورت تھی۔اس کے ذہن میں ترکیب آئی اردو تو وہ اچھی پڑھ لکھ لیتا تھا اور انگریزی بھی کچھ کچھ جانتا تھا ایک ہوٹل میں نوکر ہو گیا۔ یوں بھی جنگی حالات کے باعث نظام درہم برہم تھا' سارے نوکر بھاگ گئے تھے۔اب دن میں وہ ہوٹل میں مزدوری کرتا اور رات کو جی جان سے پڑھائی کرتا' پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتا اور دعا کے وقت زاروقطار رونے لگتا۔اس کے بس میں نہیں تھا' وہ بیقرار تھا' رات کو جب وہ تھکن سے چور' بستر پر لیٹتا تو اس کا انگ انگ دکھ رہا ہوتا مگر اقدس کا سوچ کر وہ اپنی تمام مایوسی اور تھکن کو رفع کر دیتا۔اس کے جینے کو ایک مقصد مل گیا۔

وہ محنت کرتا رہا' اقدس کے حوصلوں کی مدد سے اپنے حوصلے بلند کرتا رہا' بالآخر اس نے میٹرک پاس کر لیا مگر منزل ابھی دور تھی۔ کچھ عرصے بعد ہوٹل کی نوکری اس سے چھوٹ گئی' وہ بے روزگار ہو گیا' تین دن صرف پانی پر گزارہ کیا' انٹرمیڈیٹ کے فارم خریدنے کی آخری تاریخ قریب آتی جا رہی تھی اب کے وہ جان گیا کہ خدا نے اس کی رسی کھینچ لی ہے۔ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتی' جھوٹ کی سزا آج نہیں تو کل اسے ملنا ہی تھی۔ مگر چوتھے روز قسمت سے وہ ایک منشی کے یہاں نوکر ہو گیا۔قبل از وقت تنخواہ لے کر اس نے اپنے انٹرمیڈیٹ کے فارم خریدے۔ ایسے کڑے حالات میں اسے حوصلہ صرف اللہ سے حاصل ہوتا اور اس کے بعد اقدس سے ایک آگ جو اقدس اس کے سینے میں لگا گیا تھا اس کے جلنے سے ہی احمد کے دل کو قرار تھا۔منشی اس سے بہت سا کام لیتا' ضرورت پڑنے پر ایک دو ہاتھ بھی مار دیتا مگر اس کی سختی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ کام اچھی طرح سے سیکھ گیا اور چاہتا تو بائیں ہاتھ سے بھی کام انجام دے سکتا تھا۔اس کی محنت اور جفاکشی کا یہ عالم دیکھ کر منشی نے اسے پرچون کی دکان پر نوکر رکھوا دیا جہاں وہ حساب کتاب کا کام بخوبی سنبھال لیتا اور دوکان کا مالک بھی اس سے خوش تھا۔ساتھ ہی ساتھ پڑھائی بھی زوروشور سے جاری تھی۔ انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ آیا تو اس نے بورڈ میں تیسری جگہ حاصل کی۔اس کے ارادے اور مضبوط ہو گئے۔منزل گو کہ اب بھی قریب نہیں تھی' مگر آثار نمایاں تھے۔رہنے کو اچھی جگہ مل گئی۔ یوں ان تمام برے دوستوں سے بھی اس کا پیچھا چھوٹ گیا۔اس بار جب وہ گاؤں گیا تو ماں نے زبردستی اس کی شادی اپنی بہن کی لڑکی سے کرادی کیونکہ وہ انتیس برس کا ہو چکا تھا۔

واپس آ کر اس نے ایک اچھے کالج میں داخلہ لے لیا۔مگر گزر بسر تنگی سے ہونے لگا کیونکہ اب وہ اکیلا نہیں تھا اور بی اے کی پڑھائی بھی آسان نہ تھی۔ستم اور پر ستم یہ ہوا کہ دوکان کے مالک کے بیٹے نے احمد سے حسد کی بناء پر اس پر حساب میں گڑبڑ اور اشیاء کی چوری کا الزام دھر کر دکان سے فارغ کرا دیا۔ایک بار پھر گھر میں فاقے ہونے لگے' نئی آنے والی الگ پریشان تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ہی پکڑ کا وقت ہے اور یہ وقت کبھی نہ کبھی تو آنا ہی تھا' جھوٹ جو کسی کی موت کا سبب بنا' کی سزا تو اسے ملنا ہی تھی۔ پڑھائی کا بھی تسلسل ٹوٹ سا گیا۔ ہفتہ گزر گیا تو نیک صفت جورو نے خود سے ہاتھ پیر ہلانے کا مشورہ دیا۔ ہاتھ میں ذائقہ تو بی بی کے بہت تھا پس اسی کو ذریعۂ روزگار بنانا مفید نظر آیا۔نیک صفت نے حلیم بنا کر احمد کو تھما دی اور یہ صبح سویرے جا کر چوک میں بیچ آیا۔ پہلے ہی دن اچھے داموں حلیم بک گئی' چند ہی دنوں میں حلیم کی مٹکی کے لئے ریڑھی آ گئی اور لوگ حلیم کھانے کے لئے چوک پر پہلے ہی منتظر پائے جاتے۔سب حلیم

کی تعریف کرتے' شہرت بڑھتے بڑھتے گاہک اتنے آنے لگے کہ ایک مٹکی کی جگہ تین نے لے لی۔ گزر بسر ایک بار پھر اچھا ہونے لگا اور احمد خدا کا لاکھ شکر کرتا' اقدس کو روز یاد کرتا اور اپنا حوصلہ بڑھاتا' منزل اب بھی نہیں آئی تھی۔

پنجاب یونیورسٹی میں اس کا ایم اے انگلش میں داخلہ ہو گیا۔ ''لکشمی چوک کی حلیم'' گاہکوں کی اتنی بڑی تعداد کا مقابلہ نہ کر سکی اس لیے احمد کو ایک چھوٹی دکان کرائے پر خریدنا پڑی۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش پر اس نے اماں کو بھی گاؤں سے بلا لیا تو پھر جانے نہ دیا۔ نیک صفت بیوی اور ماں دونوں مل کر دن رات محنت کرتیں اور احمد اس محنت کی قیمت وصول کر کے گھر چلاتا۔ لوگ اس کا مذاق بناتے کہ بڈھا طوطا پڑھائی میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے مگر احمد کسی بات پر دھیان نہ دیتا۔ اسے تو بس آگے چلنا تھا۔ وہ اس مقام پر آ چکا تھا کہ اب دوسرے اس کی روشنی سے منور ہوتے' اس نے اپنی دکان جس کا نام اس نے اپنے بیٹے کے نام پر ''اقدس حلیم گھر'' رکھا تھا' پر بیروزگار اور نادار لوگوں کو کام پر رکھ لیا۔ ایم اے کے دوسرے سال اللہ نے اسے چاندسی بیٹی سے نوازا۔ اس کی خوشیوں کا کوئی حساب نہ تھا' مگر ان تمام رونقوں میں وہ کہیں خدا کی یاد سے غافل نہ ہوا تھا۔

اب وہ دکان پر کم بیٹھتا کہ تعلیم کے بعد اسے نوکری کی تلاش تھی' بالآخر اسے ایک کالج میں نوکری مل گئی۔ وہ دن اس کی زندگی کا حسین ترین دن تھا۔ اس کی آنکھیں آبدیدہ تھیں' وہ دن خوشیوں کے بیچ غم لئے ہوئے تھا۔ آج جب وہ سجدہ ریز ہوا تو اس کے انگ انگ سے اشک بہہ رہے تھے۔ اس کے تمام بدن پر رقت طاری تھی۔ اس کی ہچکیاں رکنے میں نہ آئیں حتیٰ کہ تمام جسم آنسوؤں میں نہا گیا۔

ترقی کی منازل طے کرتے کرتے وہ بہت آگے آ گیا تھا' ''اقدس حلیم گھر'' ایک بڑا اور مشہور ریستوران بن چکا تھا' انگلش میں پی ایچ ڈی کے بعد اس نے ایم اے اردو اور ایم اے عربی بھی کر لیا یہاں تک کہ اس کی تینوں زبانوں میں کتابیں بھی سند پسندیدگی حاصل کر چکی تھیں' ایک مشہور ادیب ہونے کے علاوہ وہ پروفیسر بھی تھا۔ اتنی ترقی کے باوجود غرور احمد کو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا' سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ہفتے میں غریبوں کی ضروریات کے حوالے سے دو دن نشستیں رکھی جاتیں' ہزاروں طلباء اس کی روشنی سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ صرف یہ ہی نہیں کثیر تعداد میں غریب' نادار اور بیروزگار لوگ پروفیسر احمد انصاری کی مدد سے اپنے گھر چلا رہے تھے۔ کچھ سالوں بعد پروفیسر صاحب نے ایک یتیم خانہ بھی کھولا جس کا نام ''اقدس یتیم خانہ'' رکھا گیا۔

اتنے لمبے سفر میں صرف کامیابیاں ہی ان کے نام نہیں ہوئیں' کئی دفعہ ایسے مقام بھی آئے جب کوئی راہ نہ نکلتی اور احمد کو یہ سوچنا پڑتا کہ اب پکڑ ہو چکی ہے۔ اب سزا کا وقت آ گیا ہے تمام دروازے بند ہیں' مگر پھر یکدم اللہ توقعات سے زیادہ بخش دیتا تو جینے کی نئی امنگ جنم لینے لگتی۔

یہ سب کچھ اقدس کے باعث تھا' یہ رونقیں' یہ خوشحالیاں اور رنگینیاں اس کی موت بلکہ شہادت سے اس کے نام ہوئی تھیں۔ آج بھی جب اقدس کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی تو وہ بے خود ہو جاتا' مگر وہ واقعہ اب ہوتا تو افسوس کا مقام کچھ نیچے ہوتا مگر قسمت میں یونہی لکھا تھا۔ پروفیسر صاحب اب تک نہ سمجھ سکے تھے کہ وہ خوش قسمت تھے یا نہیں؟ یہ کامیابی واقعی انہی کے نام تھی یا اقدس کے؟ اپنی اولاد میں بھی وہ اقدس کو ہی سب سے زیادہ پیار کرتے تو باقی ہمیشہ گلہ کرتے اور وہ اقدس بھی تو سب بچوں میں سب سے تیز تھا اور باپ کے نقش قدم پر چل کر اس نے بھی ایم اے انگلش کیا۔

پروفیسر صاحب کو بھی اس میں اقدس ہی نظر آتا۔ ویسے تو خدا کے فضل سے سب ہی ماشاء اللہ نیک تھے' پانچ بچے بیاہ لیے گئے تھے' پروفیسر صاحب تو نانا اور دادا بھی بن چکے تھے بس ایک بیٹی رہ گئی تھی۔

وہ بیٹی بھی پروفیسر صاحب کی بہت لاڈلی' آنکھوں کا تارا تھی۔ پروفیسر صاحب اس کی ہر بات مانتے تھے۔ اور آج اسی کے کہنے پر اس کی پسند کے لڑکے کے ماں باپ ان سے ملنے آرہے تھے۔ اچھی طرح تیار کر کے بیٹی نے باپ اور ماں کو مہمانوں کے پاس بھیجا۔

پروفیسر صاحب ڈرائینگ روم میں جیسے ہی داخل ہوئے' ٹھٹھک کر رہ گئے۔ ایک ایسا چہرہ ان کے سامنے آ گیا تھا کہ ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اقدس کی تمام تر باتیں ایک بار پھر ان کے کانوں میں گونج گئیں' انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ انہوں نے اقدس کے لئے واقعی کچھ کیا ہے' اس ملک کے لیے کچھ کیا ہے مگر یہ احساس اب آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا تھا' سامنے بیٹھی ہوئی عورت وہی دوشیزہ تھی جو اس تانگے پر سوار تھی اور ان کی بیٹی کی پسند کی ماں تھی۔ عورت کا شوہر پروفیسر صاحب سے پرتپاک طریقے سے ملا پر پروفیسر صاحب کھوئے ہوئے تھے۔ عورت نے اشارے سے سلام کیا۔ بیگم پروفیسر بھی دونوں سے ملیں اور عورت سے سوال کیا۔ ''کیا حال ہے آپ کا؟''

عورت کے شوہر نے اشارے سے عورت کو بتایا تو عورت نے اشارے سے جواب دیا۔ عورت کے شوہر نے کہا۔ ''یہ سن اور بول نہیں سکتیں' کہہ رہی ہیں ٹھیک ہیں' آپ کیسی ہیں؟''

بیگم پروفیسر نے خوش دلی سے جواب دیا اور فوراً پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا جواب بات نہیں کر سکتے تھے' جن پر ہوا بند ہو چکی تھی' جن کی سانسیں روک لی گئی تھیں اور کانوں میں روئی ٹھونس دی گئی تھی۔ وہ کچھ دیر تو بت بنے بیٹھے رہے مگر گھٹن بڑھی تو معذرت کر کے نکل آئے۔ جاتے جاتے وہ اس عورت کو اشارے کرتا دیکھ گئے تھے۔

یہ چالیس سال کا سفر تھا' جانے وہ انہیں کیسے پہچان گئے' ان کی ایک نظر کی چاہ انہیں کہاں لے آئی تھی۔ گول' موٹے اور چمکدار شیشوں کے پیچھے کتنے بھیگے کنارے تھے جو سب سے نہاں تھے۔ ان کی بیٹی ان سے پوچھ رہی تھی وہ اتنی جلدی کیوں آ گئے؟

ایک نظر کی چاہ... اور ان کی بیٹی کی بات وہاں ٹھہر گئی' چہیتی اور لاڈلی بیٹی کو انکار کیسے کرتے؟

''تو نے سزا دینے میں بہت دیر کی''۔ انہوں نے سوچا اور رومال سے آنسو پونچھ دیئے۔

زبان پر قابو

ایک بادشاہ (تکش) نے اپنے غلاموں سے ایک راز کی بات کہی اور انہیں منع کیا کہ اس بات کو کسی دوسرے پر ظاہر نہ کرنا۔

ایک سال تک تو خیریت رہی پھر ان غلاموں میں سے ایک نے اپنے کسی دوست کے سامنے یہ بھید ظاہر کر دیا اور اسے تاکید کی کہ یہ کسی دوسرے کو نہ بتانا۔ اس کے دوست نے بھی اس طرح کسی دوسرے کو یہ بات بتا دی۔ شدہ شدہ یہ بات ہر طرف پھیل گئی۔ بادشاہ کو علم ہوا تو اس نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ ان غلاموں کے سر قلم کر دو۔ ان میں سے ایک نے امان چاہی اور عرض کی کہ اے بادشاہ اپنے غلاموں کو قتل نہ کر کہ اس خطا کی ابتدا تجھی نے کی ہے۔ تو نے شروع ہی میں چشمے کا منہ کیوں بند نہ کیا۔ جب وہ سیلاب بن گیا تو اس کے آگے بند باندھنے کا کیا فائدہ۔''

تو نے جب تک بات منہ سے نہیں نکالی تیرا اس پر قابو ہے۔ جب منہ سے نکال دی تو وہ تیرے اوپر قابو پا لے گی۔

(شیخ سعدی) _____

فرح بانو

ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

آیئے آیئے خوش آمدید' ست بسم اللہ' جی آیاں نوں میرے معزز مہمان آ رہے ہیں بیٹھیئے جی تشریف رکھیئے آج کیا دیکھنے آئے ہیں۔سکٹ' ڈرامہ' گیت سنگیت' تقریری مقابلہ' یا علمی مباحثہ' اجی پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ مجھے پہچانے نہیں؟ آپ کی مجھ سے شناسائی تو زیرو ڈیز سے ہے۔ کیا اب بھی مجھے کسی تعارف کی ضرورت ہے؟ میری ہی آغوش میں آپ نے کئی سال بتائے ہیں میرے در و دیوار کی اینٹ اینٹ آپ کو جانتی ہے مگر آپ ہیں کہ مجھے ہی غیر سمجھ رہے ہیں۔ چلیں آپ کو مزید اُلجھن میں نہیں ڈالتا صاف صاف بات کرتا ہوں۔ میں آپ کا وہ خادم ہوں جو پچھلے چالیس برس سے خاموشی سے گیٹ نمبر ایک اور دو کے بیچ کھڑا ہے اور خاکسار کا اسم گرامی ہے ایوب آڈیٹوریم۔

میرا وجود اس دنیا کے نقشے پر تقریباً چالیس سال قبل رونما ہوا جب سگنل کور کے ایک سکول کے ساتھ فوجی افسران کے لئے گریژن سینما کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سکول کی عمارت کے ساتھ ہی میرا ڈیزائن اور نقشہ مایہ ناز معماروں نے مرتب کیا اور ٹھیکیدار صاحب کو تھما دیا جنہوں نے انتہائی خلوص اور محبت سے میری تعمیر شروع کرائی۔ مضبوط بنیادیں ڈالیں اور دیواریں کھڑی کرنا شروع کیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے محنت کش مزدوروں نے دن رات ایک کر کے میرا وجود توانا کیا اور دیواریں اور چھت بنا ڈالیں' کھڑکیاں اور دروازے لگائے اور میرے اسٹیج پر لکڑی کا کام کیا۔ رنگ و روغن کے بعد میرا استواں جسم کسی گھبرو جوان کی مانند تھا۔ تب میرا نام گیریژن سینما پڑا۔ ہر ہفتے کے آخر میں جمعے کی شام کو فلم کا شو ہوتا اور تمام پنڈی کے فوجی تفریح کے لئے میرے پاس چلے آتے۔ کبھی انگریزی فلم چلتی کبھی پاکستانی اس دوران جوانوں کا ولولہ دیدنی ہوتا تھا جو صحیح معنوں میں اس وقت فلم سے محظوظ ہو رہے ہوتے تھے۔ کبھی گانوں پر جھوم اٹھتے کبھی نعرے لگاتے۔ کئی بزرگ افسران بھی ویک اینڈ پر وقت نکال کر یار بیلیوں کے ساتھ مل بیٹھنے کے موقع سے فائدہ اٹھاتے۔

پھر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ میرے مضافات میں سکول اب سکول نہیں' ایک میڈیکل کالج کھولا جائے گا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ محدود وسائل کے ساتھ چھوٹی سی عمارت میں میڈیکل کالج کھولنا کیسے ممکن ہے مگر میجر سکندر الٰہی بخش صاحب (جو کالج کے پہلے ٹریننگ آفیسر تھے) کے عزائم پختہ اور حوصلہ بلند تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں کالج کی باگ ڈور میجر جنرل ایوب خان نے سنبھال لی اور کالج کے تنِ نازک میں توانائی کی روح پھونک دی۔ اس کالج کو اغیار کی نکتہ چینی کے باوجود اوجِ کمال تک پہنچایا۔ انہی کی کاوشیں تھیں کہ قابل اور محنتی اساتذہ کی ٹیم بنا کر کئی عقیق تراش کر نگیں کر ڈالے اور کالج کی شہرت بامِ عروج تک جا پہنچی۔

میں نے کالج کے پہلے Batch سے لے کر آج تک ہمیشہ عروج پر ہی پایا ہے مثلاً 2nd Batch کے وہ نوجوان مجھے آج بھی یاد ہیں جنہوں

نے Adjutant کے آڈیٹوریم میں داخل ہوتے ہی ہلٹر مچا دیا پھر تپتی دوپہر میں ریتلے میدان میں On-Hands کھڑے رہے اس کے باوجود اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے۔ کبھی 2nd Batch کے وہ لڑکے یاد آتے ہیں جنہیں سیروز سینما سے Adjutant فرنٹ رول کراتے تاروں والے میس تک لاتے تھے۔ سوچتا ہوں میرے ہوتے ہوئے انہیں وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور وہ پرنسپل صاحب بھی یاد ہیں جو آٹھویں Batch کے لڑکوں کے ساتھ ہال میں گانوں پر جھوم اُٹھتے تھے اور وہ زمانے بھی یاد ہیں جب ہندی فلموں کے شو کے لئے کالج میں پارٹ ون ہوا کرتا تھا۔ یہ وہی ہال ہے جہاں سالوں پہلے سروں کی گونج ہوتی تھی آج وہیں فائلیں کھپتی ہیں ٹائپ رائٹر بجتے ہیں۔

میرے ہی پچھواڑے میں واقع کمپنی کمانڈرز اور بٹالین کمانڈر کے آفس میں روزانہ لڑکے لڑکیاں ان کے فوجی عتاب کا نشانہ بنتے ہیں اور میری ہی دیواروں سے الٹے لٹکے پائے جاتے ہیں۔ ایکٹر بدل جاتے ہیں کہانیاں وہی رہتی ہیں۔ میرے اسٹیج نے کتنوں کے جلوے دیکھے ہیں۔ ہر کلاس کے فنکاروں کی فنکاری کا چشم دید گواہ ہوں میں۔ اُمڈتے جوش اور ولولوں سے بھرپور جوانوں کی نعرہ بازی اور ہلّڑ بازی کا شاہد ہوں۔ مایہ ناز پروفیسروں کی بارعب آواز کی گونج سے لے کر لڑکوں کے پُر جوش قہقہوں تک، جوشیلی تقاریر سے لے کر ڈراموں کے اداکاروں کی فنکاریوں تک، اثر انگیز نعتوں سے لے کر شعر و شاعری کے مقابلوں تک، اردو انگریزی فلموں سے لے کر کالج طلباء کے زبردست گرافکس تک پچھلے چالیس برسوں میں میں نے کیا کیا نہیں دیکھا۔

جو ہو گزرے ہیں اپنا نشان چھوڑ گئے ہیں، آنے والوں نے اپنے رنگ دکھانے ہیں اور میں ان سب کی یادیں سمیٹے آج بھی آنے والوں کے لئے اپنا دامن پھیلائے کھڑا ہوں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

سچ اور جھوٹ

بادشاہ نے پوچھا: ''یہ کیا کہتا ہے؟'' اَچھی فطرت کے مالک ایک وزیر نے کہا: ''اے آقا! یہ کہہ رہا ہے غصہ پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے لوگ اچھے ہوتے ہیں۔'' بادشاہ کو رحم آ گیا اور اُس نے قیدی کی سزائے موت معاف کر دی، ایک اور وزیر جو پہلے وزیر کے برعکس (بدفطرت) تھا، کہنے لگا: ''ہم جیسے لوگوں کے لیے مناسب نہیں ہے کہ بادشاہوں کی خدمت میں سچ کے علاوہ کچھ کہیں۔ اس (قیدی) نے بادشاہ کو گالیاں دی ہیں اور بُرا بھلا کہا ہے۔'' بادشاہ نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا: ''مجھے تمہارے اس سچ کے مقابلے میں اُس کا جھوٹ زیادہ اچھا لگا کیونکہ وہ بہتری پر مبنی تھا اور تمہارے سچ کی بنیاد بدنیتی پر ہے'' اور عقلمندوں کا کہنا ہے کہ: ''جس جھوٹ میں کوئی بہتری ہو، وہ فساد پھیلانے والے سچ سے بہتر ہوتا ہے۔''

——— (داستانِ سعدی سے ماخوذ)

رضا اللہ آصف

زندگی کچھ اس طرح

دُور سنہری کھیتوں میں سرسبز و شاداب ڈالیاں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کا چلبلا پن ایک روشن صبحِ نو کا عکاس ہے۔ آسمان پر تیرتی گھٹائیں ان کی مسرتوں کو چار چاند لگانے کے لیے بے تاب ہیں اور آخر کار عرشِ معلیٰ سے ''کُن'' کا حکم جاری ہوتا ہے اور زندگی سے بھرپور بوندیں بارش کی صورت میں زمین کا رخ کرتی ہیں جو کئی دنوں سے ان کی خوبصورتی کو مدہم کئے ہوئے تھا۔

باغ میں خوشیوں کا سماں ہو جاتا ہے۔ پانی پھولوں کو تر و تازگی اور توانائی بخشتا ہے تو سورج کی کرنیں ان کی رعنائی میں اضافہ کرتی ہیں۔ اسی دوران ایک نئی زندگی کا ظہور ہوتا ہے اور ایک ننھی کونپل آہستہ آہستہ اپنے چہرے سے سبز غلاف کا پردہ اٹھا کر اس دنیا میں آنکھیں کھول لیتی ہے۔

مگر۔۔۔ مگر اس کونپل کو کیا معلوم کہ جن خوبصورت پتّیوں' دل آویز پھولوں اور رسیلے پھلوں کے خواب لیکر وہ اس دنیا میں آنکھیں کھول رہی ہے وہاں خون کے پیاسوں' دولت کے پرستاروں اور بارود کے سوداگروں کی اجارہ داری ہے۔

جہاں انسان کی قیمت محض چند کھوٹے سِکے ہے۔ جہاں کے باسی اپنے گھروں سے نکلتے ہیں تو انہیں واپسی کا یقین نہیں ہوتا' جہاں عبادت گاہیں خون میں لت پت نظر آتی ہیں۔ جہاں باپ اپنے جوان بیٹے کی لاش کو سڑک پر بے یار و مددگار دیکھ کر آنسو بہانے لگتا ہے تو دوسری جانب سے ایک سنسناتی گولی اس کے سینے کو چیر جاتی ہے اور اس کے آنسو اپنے ہی خون میں جذب ہو کر اپنی بے کسی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ جہاں بہنیں اپنے بھائیوں سے عید کے لئے چوڑیاں لانے کا وعدہ لیتی ہیں مگر عید سے تین روز قبل دروازے پر سرخ چوڑیاں نہیں بلکہ خون میں بھیگے سرخ کپڑے آتے ہیں۔

جہاں ہاں۔۔۔ جہاں روز غربت سے تنگ افراد خودکُشی کرتے ہیں مگر ایوانوں میں بیٹھے حکمران اپنی ''باقی زندگی'' سنوارنے میں مصروف ہیں۔ جہاں 60 فی صد لوگ دو وقت کی روٹی کو ترستے ہیں مگر امراء اپنی عیاشیوں میں محو نظر آتے ہیں۔

جہاں میڈیا ہر بات پر تنقید کرتا ہے مگر معاشرے کی اصلاح کے فرض سے غافل ہے۔ جہاں اغیار کے طیارے ہماری وادیوں کو اجاڑ بیابان بنا جاتے ہیں مگر ہم اسے ''امداد'' کے لئے رکھی شرائط قرار دیتے ہیں۔

تو میں اس کونپل سے پوچھتا ہوں کہ کیا تو نے اس پھول سے سبق نہیں سیکھا جو تجھ سے پہلے اسی معصوم چہرے کے ساتھ دنیا میں آیا تھا مگر اب بھی تیرے سامنے زمین پر پڑا خون کے آنسو پی رہا ہے۔۔۔

اس کے جسم میں رچی خوشبو ابھی باقی تھی۔اس کی رنگت اس کے جیالے پن کی غماز تھی اور اس کی مسکان دوسروں کے لئے باعثِ اطمینان تھی۔مگر کیا ہوا۔۔۔!

وہ تو بے موت مارا گیا کیونکہ جب باغ کے باقی باسیوں کے دلوں میں محبت کی بجائے بغض، احساسات کی بجائے محض دکھاوا اور خلوص کی جگہ رسمی ہنسی جنم لے لیتی ہے تو وہاں اس پھول کی پرورش کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔جو باغ کی تر و تازگی اور خوشبو کا پیامبر تھا۔

مگر وہ کونپل اپنی ننھی آنکھیں کھولتی ہے اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ یہ جواب دیتی ہے کہ یہ اسی پھول کا دیا سبق ہے جو اس باغ کی رونق کے لیے آیا تھا مگر حالات کے ہاتھوں اپنی جان گنوا بیٹھا۔اس کی پتیاں خوشبو تو نہ دے سکیں مگر اس مٹی کی زرخیزی کا باعث بن گئیں جس مٹی سے میرے جیسی کئی ننھی کونپلیں اور ننھے پودے سر اٹھا رہے ہیں۔تب مجھے احساس ہوا کہ زندگی صرف سانسوں کے آنے جانے کا نام نہیں بلکہ زندگی چراغ کی اس بتی کی مانند ہے جو خود تو جل کر راکھ ہو جاتی ہے مگر اپنی روشنی سے کئی بھٹکے قافلوں کو منزل کی راہ دِکھا جاتی ہے۔

اسی طرح میرے وطن کے وہ باسی جو بے موت مارے گئے ان کا لہو صرف اخبارات کی زینت نہیں بنے گا بلکہ وہ ہمارے دل و دماغ میں ایک ایسے احساس کو جنم دے گئے ہیں جو پوری قوم کو انقلاب کی طرف ایک چراغ کی مانند رہنمائی دے گا۔

اور ایک وقت آئے گا جب وہ ننھی کونپل مُسکراتے ہوئے کہے گی کہ

''دیکھا وہ پھول خود تو مٹی میں گُم ہو گیا مگر باغ کے باقی پودوں کو زندگی کی ایک نئی راہ دکھا گیا۔۔۔

سلوتری

ایک شخص آشوب چشم میں مبتلا ہو گیا۔علاج کے لیے سلوتری (جانوروں کے معالج) کے پاس گیا۔اس نے وہی دوا جانوروں کی آنکھوں میں لگاتا تھا' اس کی آنکھوں میں لگا دی۔اس دوا سے آشوب چشم کیا ٹھیک ہونا تھا بے چارہ اندھا ہو گیا۔اور سلوتری سے جھگڑنے لگا۔یہاں تک کہ معاملہ عدالت میں پہنچا۔قاضی نے فیصلہ دیا کہ سلوتری پر کوئی تاوان نہیں اگر یہ شخص گدھا نہ ہوتا تو سلوتری کے پاس کیوں جاتا۔داناؤں کے نزدیک یہ کم عقلی کی بات ہے کہ ایسے کام کو کسی ناتجربہ کار آدمی کے سپرد کیا جائے جس کے لیے تجربہ اور مہارت فن لازم ہو۔

_____ (شیخ سعدیؒ)

عقل بڑی یا بھینس

مصر میں کسی جگہ دو بھائی رہتے تھے۔ایک نے علم پڑھا اور دوسرا مال جمع کرتا رہا۔نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھنے والا تو علامہ ہو گیا اور روپیہ جمع کرنے والا شاہی خزانچی بن گیا۔ایک بار دولت مند نے عالم بھائی کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا''ہم تو خزانے کے مالک ہو گئے مگر تم مفلس ہی رہے۔''

عالم بھائی نے کہا''بھائی جان! میں تو اس حال پر خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے پیغمبروں کی میراث (علم) عطا فرمائی ہے مگر آپ ہیں کہ فرعون کی وراثت (یعنی مصر کی حکومت) پر اترا رہے ہیں۔''

_____ (شیخ سعدیؒ)

عزیر اللہ

میں یہ کس کے نام لکھوں ـــــ (بہار کے نام)

وہ بھی مارچ کا ایک دن تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ گندم کے تیغ نے زمین سے سر نکالا تھا اور اب کھیتی فخر اور زعم میں سرشار دھرتی کے سینے پر لہلہا رہی تھی۔ پیڑوں پر عنادل کی میٹھی بولی اور ذوردرختوں کے جُھنڈ سے کوئل کی کوک میں آسمان کے تخت پر سورج براجماں ہونے کو تھا۔

ہاں وہ صبح تھی۔۔۔۔ بہار کی صبح اور اس صبح کا مزا دوبالا بھی اس لئے تھا کیوں کہ اِس خاندان کے ہر فرد کے دل پر بھی بہار کا موسم تھا۔ تیاریاں زوروں پر تھیں۔

میرا دوپٹّہ کہاں گیا؟ اری! دیکھو تو مہندی کا رنگ ٹھیک سے آیا کہ نہیں۔۔۔وہ صاحبہ تو اب گھنٹہ بھر میک اپ ہی کرتی رہیں گی، کسی اور کو تو موقع ملنے سے رہا۔۔۔کیا! کیسے ٹوٹ گیا؟ ابھی چند دن پہلے ہی تو لیا تھا، ایک ہی دفعہ تو پہنا تھا، ضرور کسی کی شرارت ہوگی۔

ماوں کے ہاتھوں سے تیار ہوئے بچے اب ماؤں کو تیاریاں ختم کرنے اور چلنے پر اصرار کر رہے تھے اور نادم مائیں اِس بات پر افسوس کرتی پھرتی تھیں کہ اِن سے پہلے خود کو کیوں نہ تیار کر لیا۔

ایسے میں چھ سال کا ایک چھوٹا بچہ یہ ضد لئے بیٹھا تھا کہ اُسے گھر پر رکنا ہے۔ کیا اسے مردوں میں بیٹھنا اچھا لگتا ہے؟ کیا اسے دو بہاروں کا ایک ساتھ آنا اچھا نہیں لگا تھا؟ یا شاید اسے آنے والی خزاں نما بہاریں اور بہار میں اُترتی خزاں دیکھنے کے لئے قدرت نے چنا تھا۔ شاید اسے یہ علم ہو گیا تھا کہ بہار کے بعد خزاں بھی آتی ہے یا شاید اُسے چھوٹی سی عمر میں پتا چل گیا تھا کہ جانے والے واپس نہیں آتے۔

آج پھر مارچ ہے، گندم کی فصل پھر لہلہا رہی ہوگی۔۔ معلوم نہیں۔ عنادل کی بولی اب آہیں لگتی ہیں۔ کوئل کی کوک عرصے سے سنائی نہیں دی۔ اور بھلا ایسے بھی ہوتا ہے کہ شہنائیاں نہ بجیں اور بادشاہ دربار میں آئے۔

بھلا وہ اپنی بے عزّتی کیوں برداشت کرے۔ آسمان کا تخت خالی ہے اور شاید درباری اور فریادی بادشاہ کے نہ آنے کے غم میں رو رہے ہیں کہ اُن کی فریاد کون سنے گا۔

.....

انٹر کی کسی نصابی کتاب میں پڑھا کہ مارچ امتحانات کا مہینہ ہے۔ عجیب اور نہایت مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ بہار کا مہینہ بھی ہے۔ طالبعلموں کی بہار تعلیمی امتحانات خراب کر دیتے ہیں کہ ان کے اذہان کا رس نچوڑ لیا جاتا ہے۔ پھل لگنے سے پہلے توڑ لئے جاتے ہیں۔۔ پھل لگیں بھی کیسے بھلا۔۔۔ پھول جو توڑ لئے جاتے ہیں۔ نامراد عشّاق الگ تناو کا شکار۔۔۔لوگ گلستاں کی طرف عازمِ سفر ہوتے ہیں تو عاشق عشق کی خاک چھاننے کے لئے صحراوں اور ریگزاروں میں بھٹکنے کی تمنّا کرتا ہے۔۔ اِن دو میں سے ایک گروہ نے تو بہار محسوس ہی نہیں کی جبکہ دوسرے کے لئے بہار محبوب کی آنکھوں سے چلے تیرِ نیم کش کی سی ہے کہ نہ جگر کے آر ہوتا ہے نہ پار۔۔۔بس خلش سی رہتی ہے۔

ہاں اردو کی کلاس میں روزمرّہ اور محاورہ کی بات کرتے ہوئے چاندی سے سفید بال رکھنے والے اُس پروفیسر نے ایک درشت سوال کے جواب میں خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا ''روح پر پڑنے والا گھاؤ بدن پر

پڑنے والے گھاؤ سے گہرا ہوتا۔۔۔دیر پا ہوتا ہے، موت تک اور بعد ازمرگ بھی ساتھ رہتا ہے کہ روح کو موت نہیں۔'' وہ بھی شاید مارچ ہی تھا۔۔۔۔۔۔۔جی ہاں! یقینی طور پر مارچ ہی تھا۔

مذکورہ بالا دو گروہوں کے علاوہ تیسرا گروہ بھی ہے، جس کے لوگوں کے جسم تو زخم خوردہ نہیں، غمِ عشق اور غمِ روزگار سے لاپرواہ مگر روح پر گہرے گھاؤ لئے ہوئے، اور گھاؤ بھی اس شدّت کے کہ روح لامکانی کی کیفیّت سے دو چار۔۔۔راستہ تو آسان لیکن سفر کا پتہ نہیں۔۔۔منزل بے نشاں۔۔۔ یاس ہے آس نہیں۔۔تیرگی ہے، حبس ہے اور یہ لوگ۔۔رہبر خود بے یقینی کی کیفیت میں اور رہرو غائب۔۔۔ایسے لوگ اُس کچّے گھڑے کی مانند ہوتے ہیں جس پر گھنگھور گھٹائیں برس رہی ہوتی ہیں۔۔۔جو ٹوٹ تو جاتا ہے مگر اُسی مٹی میں مل جاتا ہے جس سے بنا ہوتا ہے۔۔۔

صحیح سمجھے۔۔۔۔چھ سال کا وہ چھوٹا بچہ جو جلد اپنی زندگی کی اکیسویں بہار دیکھے گا، لوگوں کے تیسرے گروہ میں سے ہے۔جس کیلئے رشتے معنی نہیں رکھتے، جو محبت سے بے زار ہے۔بے حس ہے' بدذوق ہے' بے مروّت ہے' بداخلاق و بدلحاظ ہے' خلوص سے خالی ہے۔جس کی آنکھیں اس کے اپنے ہی ذہن کے پردۂ سیمیں پر صرف اپنے ہی دکھوں کا عکس دیکھتی ہیں۔

کیا کبھی خوش نہیں رہتا اکیس سال کا بوڑھی روح رکھنے والا یہ جوان؟ نہیں! وہ خوش رہتا ہے، اپنے تخیل کی دنیا میں۔اُس خیالی دنیا میں جہاں وہ لوگ ہیں جن کی موجودگی وہ اِس دنیا میں ضروری سمجھتا ہے، یا پھر اُس دنیا میں خوش رہتا ہے جس میں وہ رہنا چاہتا تھا۔۔ ہاں وہ ہنستا بھی ہے، وہ پرخلوص بھی ہے، باادب اور بامُروّت بھی۔محبت کا سمندر بھی اُس میں موجزن ہے اور وہ زندہ رہنے کی آرزو بھی کرتا ہے۔۔۔لیکن صرف اُس دنیا میں۔۔۔

مضحکہ خیز اور نہایت توجہ طلب بات یہ ہے کہ وہ اس تخیلاتی دنیا کو ذہنی طور پر قبول کر چکا ہے۔لوگوں کو اپنی اُس فرضی دنیا کے قصے بھی سناتا ہے' جس کے سب کردار فرضی ہیں جن کا حقیقی دنیا میں وجود ہی نہیں۔

اسی لئے 'کذاب' کا لقب بھی سینے پر سجائے پھرتا ہے۔لیکن کیا کرے یہ بد بخت روح۔۔۔کچھ لوگوں کے لئے تو زندہ رہنا ہی ہے نا! اور زندہ رہنے کے لئے خوشی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔چاہے جھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔

مگر چھ سال کا یہ بچہ حساب کے دن' فرقان کے دن اقتدارِ اعلیٰ کے سامنے' انصاف کے ایوان میں یہ دہائی ضرور دے گا کہ اُس چھوٹی سی عمر میں جب اسے ناانصافی' زیادتی' خودغرضی' بغض' کینہ' جھوٹ' تعصب اور نفرت جیسے الفاظ کے ہجے بھی نہیں آتے تھے تو اُس نے کس سے جھوٹ بولا؟؟ کس سے بغض اور کینہ رکھا؟ معصومیت کے اُن دنوں میں کس سے نفرت کی؟ کب تعصب میں مبتلا ہوا؟

اور اگر یہ سب نہیں کیا تو اُسے کس ناکردہ گناہ کی سزا دی گئی؟ یا پھر کسی ''اپنے'' کے گناہ کی سزا دی گئی۔کیوں چھوٹی سی عمر میں اپنوں کی محبت چھینی گئی؟ کیا یہی محبتیں ناسمجھی کے زمانے میں نہیں چھینی جا سکتی تھیں۔۔اگر سب کچھ راکھ کرنا مقصود ہی تھا تو سفید راکھ کے نیچے سلگتی چنگاری کیوں چھوڑی؟

مان لیا یہ سب ایک اتفاق تھا لیکن ہوا کو تو روکا جا سکتا تھا نا!

لیکن چنگاری کو سلگانے اور راکھ کو اڑانے کو ہوا بھی بھیجی۔

کیوں؟

زندگی کی ہر ڈھلتی شام کے ساتھ ایک نیا سوال ذہن میں ابھرتا ہے۔

سنا ہے اُس دن کسی فریادی کو فریاد کرنے سے روکا نہ جائے گا۔تو یہ طفلِ ناداں سوال کرے گا اُس کے حضور میں جس کی حضور سے گردشِ دوراں کو چلانے کے احکامات صادر ہوتے ہیں۔

ابو بکر دائود

مجھے تم سے محبت ہے

''پاگل ای اوئے۔۔۔پاگل ای اوئے اس آواز کے ساتھ ہی میری کنپٹی پر ایک پتھر لگا اور میں ایک کٹے شہتیر کی طرح زمین پر آ رہا۔

یہ آواز میرے کانوں میں مدہم ہونے لگی اور پسِ منظر میں ایک اور آواز ابھرنے لگی۔اندھیرے کی ایک دبیز چادر چھٹنے لگی۔

''مجھے تم سے محبت ہے''

''کیا کہا۔۔۔؟''وہ تیوری چڑھا کر بولی

''مجھے تم سے محبت ہے۔''

اُس نے غصے سے مجھے دیکھا اور فوراً چھت سے نیچے چلی گئی۔

گرمیوں کی ٹھنڈی شاموں میں میں اکثر چپکے سے دادی کی چھت پر چڑھ جایا کرتا اور اس ماہ رُخ کا دیدار کیا کرتا تھا۔ایسی ہی ایک شام کو جب پرندے اپنے ہم سفر کی تلاش میں چُور اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے جب سُورج اپنی تمازتیں سمیٹنے کے بعد، اُفق پر لالی بکھیرنے لگا تھا، میں نے اُس ماہ رُخ سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔

''بیٹا۔۔۔! کیا گلی کے درمیان میں گرے پڑے ہو۔۔۔اُٹھو۔۔۔!''

یہ آواز مجھے ایک سہانے ماضی سے ایک ویران حال میں لے آئی۔

میں نے جلدی سے اپنے حواس پر قابُو پایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے گلی سے ملحقہ پارک کی طرف چل دیا۔ایک بنچ پر بیٹھ کر بچوں کو اٹھکیلیاں کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

''نہیں بیٹا نہیں۔۔۔۔ پھُولوں کو نہیں توڑتے کیونکہ اسی سے تو پودوں کی خوبصورتی ہوتی ہے۔میں نے آواز کے رخ پر دیکھا تو سرخ گلاب کے پھول مجھے ماضی کے دریچے میں دھکیلنے لگے۔

''تم کیا چھپا رہے ہو مجھ سے۔۔۔؟''اس نے پیٹھ پیچھے بندھے میرے ہاتھوں کو تجسس سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے سرخ گلاب کا پھول اس کے سامنے کر دیا اور خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔

پھر وہ شوخی سے کہنے لگی''میں ایک شرط پر اسے اپنے پاس رکھوں گی۔۔''

''کیا۔۔۔؟''میں نے بے چینی سے پوچھا

اُس نے سرخی بکھیرتے چہرے پر ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ اپنی نازک کلائی میں سے کانچ کی دو چوڑیاں اتاریں اور کہنے لگی''جب تک انھیں اپنے پاس رکھو گے تب تک میں اس پھول کو اپنے پاس رکھوں گی۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے میلے سے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بٹوے کے ایک خفیہ خانے میں رکھے اس کانچ کے ٹکرے کو ٹٹولا۔فرحت اور تازگی کی ایک لہر میرے انگ انگ میں اتر گئی۔

پھر مجھے وہ دن یاد آنے لگا جب ایک ہمسائی نے میری دادی کے سامنے میری خفیہ ملاقاتوں کا راز افشاں کر دیا۔یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ چودھری کرم دین کی بیٹی اور دینو کمہار کے بیٹے کے درمیان ''کچھ کچھ'' چل رہا ہے۔

لیکن ملاقاتوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

ماں باپ نے سمجھایا' بجھایا' مارا پیٹا لیکن جوانی کی محبت ہی کیا جو کسی نصیحت پر کان دھرے۔

ایک دن چودھری کرم دین نے مجھے اور ابا کو اپنی حویلی میں بلایا اور ابا کی جی بھر کے بے عزتی کر لینے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا ''جس طرح زمین اور آسمان کبھی نہیں ملتے بالکل اسی طرح کبھی بھی یہ میل نہیں ہوسکتا اور اگر اب بھی تو اپنی اِن حرکتوں سے باز نہ آیا تو تیرے ٹکڑے کروا کر اپنے کتوں کو کھلا دوں گا۔''

اور پھر ایک دن۔۔۔

''اماں ابا نے اس سارے معاملے کے بعد میرے پھوپھی زاد سے میری نسبت طے کر دی ہے'' اُس نے مجھے سرد مہری سے بتایا ''اور اب میں تم سے نہیں مل سکتی۔۔۔''

مجھے یوں لگا کہ جیسے میں ایک مسافر ہوں' ایک ایسا مسافر جو سراب کو ایک نخلستان سمجھ کر اُس کا تعاقب کر رہا ہو' ایک سراب۔۔۔ایک دھوکہ۔۔۔ دل کو چکنا چور کر دینے والا دھوکہ۔۔۔ایک ایسا دھوکہ جس سے زندگی اور موت میں کوئی تفریق نہیں رہتی۔انسان جیتے جی مر جاتا ہے۔

''لیکن۔۔۔لیکن تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو۔۔۔تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔۔۔؟'' میں نے اپنی آواز میں آنے والی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

اس کا جواب نہ پا کر میں جھنجھلا اٹھا اور چیخنے لگا ''تم تو مجھ سے محبت کرتی ہو۔۔۔''

وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی' اور مجھے کسی قزاق نے ۔۔۔ ظالم سماج نے۔۔۔میری زندگی بھر کی متاع سے محروم کر دیا تھا۔

''یہ ذات پات' یہ اونچ نیچ' اسے ہمارے معاشرے میں اتنی اہمیت کیوں ہے۔۔۔؟ حالانکہ اسلام نے ان چیزوں سے منع کیا ہے۔'' میں بیٹھک میں بیٹھا دوستوں کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا کہ اچانک گلی میں کچھ افراتفری محسوس ہوئی۔ایک لڑکے نے بیٹھک میں جھانک کر کہا کہ ''چودھری کرم دین کی اکلوتی بیٹی نے خودکشی کر لی ہے''

میں جہاں بیٹھا تھا وہیں پتھر بن گیا۔۔۔ہونٹ کپکپانے لگے۔۔۔زبان تھرتھرانے لگی۔۔۔ہاتھ کانپنے لگے۔۔۔آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔۔۔ کانوں میں سیٹیاں چلنے لگیں۔۔۔اور دماغ سن ہو گیا۔

میں نے اپنی تمام قوتوں کو اکٹھا کیا اور چودھری کی حویلی کی طرف چلنے لگا۔ دوستوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں اُس ماہ رخ کا آخری دیدار کرنا چاہتا تھا' جس نے ظالم سماج کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔

جونہی میں حویلی میں داخل ہوا تو لوگوں کی سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔مجھے دیکھ کر لوگ رستہ بدلنے لگے۔ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا میں چارپائی کے پاس آیا اور دھندلے منظر کو صاف کرنے کے لیے اپنی آنکھوں کو پُونچھا۔ وہ ماہ رُخ آنکھیں بند کیے پُرسکوں نیند سو رہی تھی۔اُس کا چہرہ یوں سفید ہو رہا تھا جیسے شام کی لالی پر کہر کی سفیدی غلبہ پا رہی ہو۔اور گردن کے گرد رسی کے نشان بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

اچانک صحن سے ملحقہ کمرے میں سے چودھری کرم دین باہر نکلا۔مجھے سامنے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

''ساقو۔۔۔!'' چودھری نے ایک خاص نمک حلال کو آواز دی

''جی۔۔۔چودھری صاب'' ساقو نہایت ادب سے بولا

''لے جا اس کتے کو اور آج کے بعد یہ مجھے نظر نہ آئے۔۔۔'' چودھری دولت اور اونچی ذات کے نشے میں چُور تھا حالانکہ یہ دونوں چیزیں تو اللہ کی دین ہیں۔

اچانک تین قوی الجثہ آدمی مجھ پر پل پڑے اور مجھے مارتے پیٹتے کھیتوں میں لے گئے اور مجھے نیم بے ہوشی کی حالت میں پھینک آئے۔

میں زخمی حالت میں شہر کو گاؤں سے ملانے والی سڑک کی طرف رینگنے لگا۔ چاچا رب نواز کسی کام سے اپنی گدھا گاڑی پر شہر جا رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا تو گاڑی روک لی اور سہارا دے کر مجھے اُس میں بٹھا لیا۔

سارا راستہ میں یہی سوچتا رہا کہ میرے ابا کا نام بھی ''کرم دین'' ہے اور اس چودھری کا بھی۔ لیکن اُس چودھری کو ''چودھری کرم دین'' اور میرے ابا کو ''دینو کمہار'' کہا جاتا ہے۔ یعنی وہی عزت دار ہے جس کا خاندان اعلیٰ و ارفع ہے۔۔۔بس۔۔۔؟

شہر پہنچ کر چاچا کا شکریہ ادا کیا اور ایک انجان گلی میں داخل ہو گیا۔ میلے اور پھٹے ہوئے کپڑوں، خون رِستے زخموں اور لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا جا رہا تھا۔

''پاگل ای اوئے۔۔۔پاگل ای اوئے'' اس آواز کے ساتھ ہی میری کنپٹی پر ایک پتھر لگا اور میں ایک کٹے شہتیر کی طرح زمین پر آ گرا۔

جدعا افتخار

ایک آؤٹ پاس کی آپ بیتی

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں یا جگ بیتی

السلام علیکم:

میں ای۔ایم۔ای کالج کا ایک آؤٹ پاس ہوں جو کہ گرلز ہاسٹل کے باہر ایک کچرے کے ڈبے میں اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کر رہا ہے۔ آج میری کوئی قدر نہیں، مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں لیکن میرے حالات ہمیشہ ایسے نہ تھے۔ آج میں اس کچرے کے ڈبے میں پڑا سڑ رہا ہوں مگر میرا ماضی بہت خوبصورت رہا ہے۔ میری زندگی کا ایک لمبا عرصہ گرلز ہوسٹل کی دیوار پر لٹکتے ہوئے گزرا ہے۔ لڑکیاں آتے جاتے مجھ پر نظر ڈالتیں کیونکہ میں ان کے لیے باہر جانے کا ذریعہ تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب میں ایک سادہ کاغذ تھا۔ مجھے چھاپہ خانہ لیجایا گیا۔ میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ مجھ پر ای۔ایم۔ای کالج کا آؤٹ پاس پرنٹ ہونے جا رہا ہے تو مجھے دلی خوشی ہوئی کیونکہ میں ہمیشہ کسی ایسی جگہ جانے اور وہاں کا ماحول دیکھنے کا اشتیاق رکھتا تھا اور اب یہ میرے لیے بہت بڑی خوش قسمتی تھی۔ بیرا مجھے چھاپہ خانہ سے ای۔ایم۔ای کے گرلز ہاسٹل لے گیا۔ مگر افسوس وہاں مجھے دروازے کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ میں اپنے کئی دوسرے ساتھیوں کے ساتھ وہاں لٹکا انتظار کرتا رہا کہ کوئی مجھے لینے آئے اور میری زندگی کا نیا سفر شروع ہو۔

پریشان و برہم سب اقدار محکم
الٰہی کہاں سے کہاں آ گئے ہم

آخر کار میری زندگی میں وہ دن بھی آ ہی گیا۔ ایک لڑکی کو اپنے گھر جانا تھا۔ اس نے مجھے دیوار سے اتارا اور مجھے میرے دوستوں سے جدا کر کے ایک میز پر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہاتھ میں قلم اٹھائے آئی اور بدحواسی کے عالم میں مجھ پر لکھنے لگی۔ اف آج بھی یاد ہے مجھے جب وہ قلم کی نوک میرے نرم و ملائم بدن کو چیر رہی تھی۔ مجھے بہت درد ہوا مگر اس بات کی خوشی بھی تھی کہ میں اب اس دنیا سے نکل کر دوسرے ماحول جاؤں گا پر مجھے کیا معلوم تھا کہ

ای۔ایم۔ای کی حدود کو عبور کرنا اتنا آسان نہیں۔ کچھ دیر بعد بیرا آیا اور مجھے بی سی کے آفس لے گیا۔ بی سی نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے گھورا۔ ان کے تاثرات مجھے کسی خطرے کی نوید دے رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور اس لڑکی سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ بی سی کو دیکھ کر مجھے ایک ہی شعر یاد آرہا تھا:

لفظ میں جھلکے دباؤ خون کا
جنوری میں جیسے موسم جون کا

ابھی میں اپنی سوچوں میں ہی گم تھا کہ اچانک بی سی کی گرجدار آواز مجھے واپس اس بے رحم دنیا میں لے آئی۔ اس نے مجھے بے دردی سے میز پر پٹکا اور بیرے سے کہا ''اسے واپس لے جاؤ اور کہنا جگہ اور وقت صحیح نہیں''۔ دوسری طرف وہ لڑکی بے صبری سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ جب بیرا مجھے لیے ہوسٹل میں داخل ہوا تو وہ لڑکی میری طرف جھپٹی مگر مجھے دیکھ کر اسے بے حد مایوسی ہوئی کیونکہ مجھ پر بی سی کے دستخط نہیں تھے۔

بیرے نے اسے بی سی کا پیغام دیا۔ وہ مجھے لیے بی سی کے دفتر بھاگی۔ دفتر کے باہر لمبی قطار تھی۔ انتظار کرتے کرتے آدھ گھنٹے بعد اس کی باری آئی۔ بی سی نے بتایا کہ اس نے مکمل پتا نہیں لکھا مزید یہ کہ ہم کسی بھی طالب علم کو اتنی لمبی چھٹی نہیں دے سکتے۔ وہ چیختی رہی کہ اسے بہت ضروری کام ہے مگر اس افسر نے ایک نہ سنی۔ ہائے یہ وہ وقت تھا جب مجھے اس لڑکی پر بے حد ترس آیا۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تھک ہار کر لڑکی نے بی سی کی بات مان لی اور اپنی چھٹی کا دورانیہ مختصر کر دیا۔ آخر کار بی سی نے مجھ پر دستخط کر دیے۔ وہ لڑکی بے حد مایوسی سے بی سی کے دفتر سے نکلی' ہاسٹل آئی' اپنا سامان اٹھایا اور نکل گئی۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ ای۔ایم۔ای کی حدود کو عبور کرنے میں ابھی ایک اور منزل باقی تھی جو کہ مین گیٹ تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھائے مین گیٹ پر پہنچی۔ وہاں اس نے مجھے ایک آفیسر کو دے دیا۔ شومئی قسمت اب بھی میں اس کی امیدوں کو پورا نہ کر سکا۔ ہائے اب بھی مجھے اس لڑکی کا بے کس چہرا نظر آتا ہے جب اسے معلوم ہوا کہ جلدی میں مجھ پر مہر ہی نہیں لگوائی۔ وہ لڑتی رہی کہ مجھے دیر ہو رہی ہے میری بس چھوٹ جائے گی مگر اس کی کسی نے نہ سنی اور نہ ہی اسے باہر جانے دیا۔

اس گلی میں کیا ستارے تھے جو دفنائے گئے
ہم جہاں کھوئے گئے اب تک وہیں پائے گئے

وہ بھاگتی ہوئی بی سی آفس پہنچی۔ اُف پھر وہی لمبی قطار۔۔۔ وہ ادھر ادھر بھاگتی رہی۔ آخر ایک ملازم کو اس پر ترس آیا اور وہ لڑکی کو دفتر میں لے گیا۔ اور پھر بالآخر مجھ پر مہر لگ گئی۔ وہ بھاگتی ہوئی گیٹ پر واپس پہنچی مجھے افسر کو دکھایا' سڑک پار کر کے ٹیکسی لی اور ڈائیوو کا رخ کیا۔ اس وقت میں اس کے پرس میں تھا۔ اس دن تو ٹریفک کا رش بھی پورے عروج پر تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ساری مصیبتیں آج ہی نازل ہونی ہوں۔ اس لڑکی کی بے چینی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ آدھ گھنٹے میں ہم ڈائیوو اسٹیشن پہنچ گئے۔ اس نے ہڑ بڑاہٹ میں ٹیکسی والے کو زیادہ پیسے دے دیئے۔ مگر افسوس اس کی بے حد کوششوں کے باوجود اس کی حالت دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ کیا اس سب کا میں قصوروار تھا۔ وہ لڑکی گم سم ای۔ایم۔ای واپس لوٹی۔ مایوسی کے عالم میں وہ چلتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے حالات پر بہت غصہ تھا خاص طور پر مجھ پر۔ اس نے بڑی بے رحمی سے مجھے مسلا اور کچرے کے ڈبے میں پھینک دیا۔ اور اب میں یہیں اپنے آخری ایام بسر کر رہا ہوں۔ مرتے دم تک میں اس بے کس کی حالت بھول نہیں پاؤں گا اور شاید نہ ہی یہ جان پاؤں گا کہ اس میں میرا قصور تھا یا نہیں؟

یہی بس اک کام کر رہے ہیں
قفس میں آرام کر رہے ہیں

محمد طہٰ منظور

خبردار آگے ای ایم ای کالج ہے

حسرت ان غنچوں پہ ہے
جو بن کھلے مرجھا گئے

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم آزاد ہوا کرتے تھے یعنی ابھی ہم ای ایم ای کالج نہیں آئے تھے۔ گرمیوں کی ایک گرم دوپہر میں ہم لوڈ شیڈنگ کے مزے لوٹ رہے تھے۔ درخت کی چھاؤں میں ہم سونے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ پہلے تو ہم نے توجہ نہ دی۔ پر نوکیا کی ٹون ٹون والی آواز نے ہمیں زیادہ دیر سونے نہ دیا۔ ہم نے آنکھیں کھولے بغیر ہی فون اٹھایا۔۔ اس سے قبل کہ ہم کچھ بولتے ان الفاظ نے ہمارے اوسان خطا کر دیے "اوے یار تیرے نسٹ کے رزلٹ کا کیا بنا؟ ہم پریشانی کے عالم میں بوکھلا کر جاگے۔ پہلے تو اسے ایک بھیانک خواب سمجھے پر جب چارپائی سے نیچے جا گرے تو اسے ایک بھیانک حقیقت پایا۔ لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑتے ہیں پر ہمارے تو دماغ کے طوطے اڑ گئے اور ایسے اڑے کہ فون کرنے والے سے اس کا نام پوچھنا بھی بھول گئے۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ وہ ہمارے دوست راوذکوان صاحب تھے۔ فون وہیں چھوڑ کر ہم کمپیوٹر کی جانب لپکے۔ اب کمپیوٹر آن کر کے ہم یہ سوچنے لگے کہ آخر ہمارا رولنمبر کیا تھا؟ بہت سوچا پر یاد نہ آیا۔ اپنے کاغذات میں تلاش کیا پر کچھ نہ ملا۔ آخر گھر کی ایک دیوار کے کونے پر اسے لکھا ہوا پایا۔ جلدی جلدی رولنمبر کمپیوٹر میں ڈالا اور آنکھیں بند کر کے تمام سورتیں جو ہمیں یاد تھیں پڑھ ڈالیں۔ دل میں خوف لیے آنکھیں کھولیں تو اپنے کامیاب ہو جانے کا یقین نہ آیا۔ ہم سمجھے کہ ضرور یہ کوئی خواب ہے۔ ہم نے اپنے پیٹ پر چٹکی کاٹی، درد کے احساس نے ہمارے اندر خوشی کی لہر دوڑا دی۔ پر ہمیں اپنے حواس پر بھی یقین نہ آیا۔ لہذا اپنے ایک دوست کو آواز لگائی۔ اس نے ہمیں ہماری کامیابی کی خوش خبری سنائی تو ہم خوشی سے جھوم اٹھے۔ ہم نے شاہد آفریدی سے لے کر جان سینا تک ہر ایک کے ویکٹری سٹائل دوہرا ڈالے۔ گلی میں ہم دیوانہ وار چلانے لگے کہ اب ہم نسٹین ہیں۔ لوگوں نے سوال کیا کہ یہ نسٹ کیا بلا ہے؟ یہ سننا تھا کہ ہم آگ بگولہ ہو گئے۔ اور نسٹ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ ان دنوں ہماری حالت کچھ یوں ہوگئی تھی کہ ہم روز صبح اٹھ کر سب سے پہلے اپنی کامیابی کا موصول ہونے والا خط دیکھتے، دن بھر اسے جیب میں لیے پھرتے اور پھر رات کو سونے سے پہلے اسے چوم چاٹ کر تکیے کے نیچے رکھتے۔ ہمیں بس اس دن کا انتظار تھا کہ جس دن ہم بھی یونیورسٹی جائیں گے۔ پر شاید خدا کو ہمارا غرور پسند نہ آیا اور اور اس نے ہمیں ای ایم ای کالج کے سپرد کر دیا۔

ای ایم ای کالج میں آمد کا دن آن پہنچا۔ ہم دل میں خوشیوں کی امیدیں لیے گھر سے نکلے۔ ہم دل ہی دل میں یہ سوچ رہے تھے کہ آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا اتنی شدت سے انتظار تھا۔ اب عیاشی ہی عیاشی ہوگی۔ پھول بھی ہونگے اور کلیاں بھی۔ مانو بس جنت ہوگی۔ پر جلد ہی ہماری خوشیوں پر پانی پھر گیا۔ یہاں نہ تو پھول تھے نہ کلیاں جہاں دیکھا بس کانٹے ہی

کانٹے پائے وہ بھی زہر میں بجھے ہوئے۔دل خون کے آنسو رویا پر خود کو سنبھالا۔ابھی اس غم سے نکلے نہ تھے کہ ایک اور غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ حکم صادر ہوا کہ آئندہ سے یونیفارم پہن کر آئیں۔یہ سن کر ہم خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔یونیورسٹی میں بھی یونیفارم؟ ہم سمجھ گئے کہ اب مصیبتیں روز آئیں گی اور روز ہمیں اذیت دی جائے گی۔اور یہی ہوا ایک کے بعد ایک ہم پر پابندیاں لگیں اور ہم چپ چاپ سہتے گئے۔

اپنی آزادی بیچنے کے بعد ہمیں کلاس میں بھیجا گیا۔ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ پہلے روز ہی پڑھائی بھی ہوگی۔سر حمید اللہ نے پہلی کلاس لی اور چند میٹھی میٹھی باتیں کیں جو ہمیں بالکل سمجھ نہ آئیں۔پھر باتیں کڑوی ہوتی گئیں اور ہمیں ابھی بھی کچھ سمجھ نہ آیا۔ایک ہفتہ بعد جا کر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اس روز سر حمید اللہ نے ہمیں کون سا مضمون پڑھایا تھا اور یہ کہ وہ ان کا پہلے سمسٹر کا پہلا اور آخری لیکچر تھا۔

اس کے بعد بریک ہوئی۔بریک میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بیان کرتے ہوئے ہماری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔۔۔۔۔دل پھٹ جاتا ہے۔۔۔ہمیں ہمارے اندر کا خود دار اور پر وقار انسان خودکشی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔۔۔آ آ آ آ آ آہ ہ ہ ہ ہ۔۔۔۔آج تک فولینگ اور ریگینگ کی محض داستانیں ہی سنی تھیں۔پر اب ہم بھی ان داستانوں مین سے ایک داستان بننے جا رہے تھے۔

پہلے پہل تو گراونڈ میں لے جا کر ہماری ''دنیا بدلی گئی''۔ایک اونچے قد کے لڑکے کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی ٹانگوں کو پھیلا کر کھڑا ہو اور ہمیں حکم دیا گیا کہ اس کی ٹانگوں کے بیچ میں سے یہ کہتے ہوئے گزریں کہ'' آج میری دنیا بدلی گئی''۔پھر اس لمبے لڑکے کو حکم ہوا کہ اب وہ اپنی دنیا بدلنے کے لیے سب کی ٹانگوں کے بیچ میں سے گزرے۔ایک سینئر نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنے بازو پھیلا لوں اور بھاگنے کے ساتھ ساتھ چلاؤں کہ'' دیکھو میں سپائیڈر مین ہوں''۔

پھر ہم سے نجانے کیسی کیسی چیزوں کو چلانے کے طریقے پوچھے گئے۔اس کے علاوہ یہ حکم تھا کہ ہر سینئر کو دیکھتے ہی با آواز بلند'' اسلام علیکم سر'' کہا جائے اور اگر سلام کرنے میں دیر ہو جاتی یا سلام آہستہ آواز میں کیا جاتا تو شامت آجاتی اور چاروں اطراف سے'' لاؤڈر لاوڈر'' کی آوازیں آنے لگتیں جس سے دل سہم جاتا۔کبھی کبھا تو ایسا بھی ہوتا کہ کلاس تک پہنچتے پہنچتے ہم سینکڑوں دفعہ سلام کیا کرتے۔حتی کہ گھر جا کر والد صاحب کو بھی با آواز بلند'' اسلام علیکم سر'' کہہ بیٹھتے جس سے پورا گھر لرز اٹھتا۔

ہمیں پھونک مار کر پنکھا چلانے کو بھی کہا گیا اور پھر اسی بات پر بے عزتی بھی کی گئی کہ تم انجنیئر بننے آئے ہو اور اتنا بھی نہیں پتا کہ پنکھا بٹن آن کرنے سے چلتا ہے؟ جاؤ بٹن آن کرو۔جب ہم بٹن آن کر بیٹھے تو کہا گیا کہ اب زور زور سے چلاؤ''یس میں نے پنکھا چلایا ہے''۔غرض ہمیں بے عزت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا۔

اور تو اور شامت کے دوران کسی بات پر ہنسنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ایسا محسوس ہوتا گویا ڈگری 34 کا ہونا قتل کے جرم سے بڑھ کر تھا۔بس ایک ہی سوال ہوتا'' کون سی ڈگری؟'' اگر آپ کا جواب ۳۴ ہوتا تو سمجھ لیجیئے کہ آپ بھی ایک داستان بننے والے ہیں۔ہم سے عجب سوال پوچھے جاتے ''ای ایم ای کیوں آئے ہو؟'' ہم جواب میں کہا کرتے'' انجنیئر بننے'' یہ سن کر وہ ہمیں سنانا شروع کر دیتے " ای ایم ای اچھا ہے تو بھلا باقی ادارے برے ہیں؟ تمہیں کیا پتا ؟ یہ وہ۔۔۔بندہ ان سے پوچھے کہ جناب آپ کو پتا ہے تو آپ کیوں نہیں چلے جاتے کسے اور ادارے میں۔۔۔پر ہم میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ ان کے سامنے چوں چراں کرتے۔ہمیں تو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے چپ چاپ ان کی سنتے رہتے۔اکثر'' اولڈ بلڈنگ'' میں چھپ جایا کرتے کیوں کہ وہاں

سینیئرز کا آنا جانا کم تھا۔وہاں ایک دوسرے کی دکھ بھری داستانیں سنتے اورایک دوسرے کودلاسے دیتے کہ بس دو،تین ہفتوں کی تو بات ہے۔ صبر کرو۔پر وہ دو،تین ہفتے ہم نے کس طرح جھیلے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ ہم رات کوسوتے ہوئے بھی یہی سوچا کرتے کہ کل کیا ہوگا؟سینیئرز کی آوازیں ہمیں رات بھر سونے نہ دیتیں۔۔۔بس میں بھی ہمیں بخشا نہ جاتا۔ہمیں نہایت پیار سے ایک سٹول پر بٹھایا جاتا اور پھر حسب دستور سبزی والے سے لے کر ٹین ڈبے والے تک ہر ایک کی نقل کروائی جاتی۔ہم سے ہمارا ٹیلنٹ پوچھا جاتا۔۔۔ٹیلنٹ بتانے پر حکم صادر ہوتا کہ کل فلاں کام کر کے لے آنا۔ہم سے ''قیام پاکستان میں نرگس کے کردار'' پر تقریریں بھی کروائی گئیں۔''فریش مین فرینڈلی'' والوں نے ہمارے ساتھ عجب کھیل کھیلا۔ پہلے جی بھر کر عزت اتاری اور پھر بڑی بڑی تقریریں کیں۔اس لیے ہم انہیں ''میٹھی چھری'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہاں میں اس ہستی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس کو دیکھ کر میری روح تک کانپ جاتی تھی۔ان کے رعب کی کیا مثال دوں کہ ڈگری 34 والے ان کو آتا دیکھ کر ہی رستہ بدل لیتے اور چھپنے کی کوشش کرتے۔اس عظیم ہستی کا نام ''سرکمال'' ہے۔سرکمال جن کا تعلق ڈگری 31 سے ہے ای ایم ای کی تاریخ کے نامور ریگرز میں سے ایک ہیں۔وہ اپنی مثال آپ ہیں۔خدا گواہ ہے کہ ای ایم ای میں گزرے پہلے مہینے کے دوران دن رات ہمارے ذہن انہی کے بارے سوچتے رہتے۔ہر روز ان سے آنکھ بچا کر نکلنے کی کوشش کرتے پر ان کی عقابی نگاہ سے کوئی بچ نہ پاتا۔صبح صبح ہی وہ ہمیں پکڑ لیتا اور ''چن اپ'' کرا کے ہمارے جذبات اور احساسات کے ساتھ جی بھر کر کھیلتے۔ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جب کہیں، جہاں کہیں بھی ہمیں دیکھ لیتے، ہماری آؤ بھگت ضرور کیا کرتے۔حتی کہ جب تمام سینیئرز نے بھی ہمیں بخش دیا تب بھی وہ ہمیں اپنے عتاب کا شکار بناتے۔سچ پوچھیے تو ان کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی ہمارے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور دل میں یہ خیالات ابھر رہے ہیں کہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔۔۔یا خدا مجھے سر کمال کے عتاب سے بچا۔۔۔

کچھ سینئرز ہمیں خوشی کی نویدیں بھی سنایا کرتے۔سر بلال، جنہیں بہت سے لوگ آج بھی ڈگری 33 کا سمجھتے ہیں حالانکہ ان کا تعلق ڈگری 13 سے ہے، اکثر کلاس میں آیا کرتے اور دل بہلانے کی باتیں کیا کرتے۔ان کا موضوع بحث اکثر ''پھول'' ہوا کرتے تھے۔ان کی باتیں سن کر ہم میں ای ایم ای میں رہنے کا حوصلہ پیدا ہوتا۔پر نجانے وہ پھول کہاں ہیں؟ ہمیں تو آج تک صرف گوبھی کے پھول ہی نظر آئے ہیں۔سر بلال سے ہمیں بس یہی شکوہ ہے کہ وہ یہ تو بتا دیتے کہ جن پھولوں کی باتیں وہ کیا کرتے تھے دراصل وہ پھول گوبھی کے تھے۔

المختصر یہ ظلم وستم کی ایک لازوال داستاں ہے جسے بیان کرنے کے لیے صدیاں چاہیں۔ہماری کیفیت وہ تمام لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس دور سے گزرے ہیں۔ پر ہم نے بھی صبر کا کڑوا گھونٹ پی لیا ہے اور ڈگری 35 کی آس میں خود کو سنبھالا ہوا ہے۔۔۔روز ای ایم ای آتے جاتے یہی خیال آتا ہے کہ کوئی بات نہیں ڈگری 53 تو آئے گی نا پھر دیکھنا۔۔۔سچ پوچھیے تو اسی بات نے ہمیں زندہ رکھا ہوا ہے۔

اور حقیقت یہی ہے کہ جس طرح ہم ڈگری 36، 35 اور 37 کے انتظار میں اپنے چار سال گزاریں گے ہمارے سینئرز نے بھی اسی طرح ہمارے انتظار میں یہاں وقت گزارا ہے۔آخر میں ہم اپنے آنے والے چار سال کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک سیاسی بیان کے ساتھ آپ سے اجازت چاہیں گے کہ

''ہمارے سینیئرز تو بہت اچھے ہیں، ہم تو مذاق کر رہے تھے''

گمنام

ایک کمبل کی آپ بیتی

میری داستان ایسی بدقسمتی کی داستان ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس ٹیم پر پیسے لگائے ہیں اس کے مخالف ٹیم کا آخری گیند پر چھکا مار کر جیتنا اور گیند سیدھی آپ کے سر پر لگنا۔ میری پیدائش کے وقت ساری دنیا کی کمبختی آئی ہوئی تھی۔ زلزلے نے ساری دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا' سیلاب کا ریلا ہر شے بہالے گیا تھا۔

جس وقت میرا دھاگہ فیکٹری میں پہنچا اس وقت مالک کی بیوی اسے سرِ عام جوتیوں سے پیٹ رہی تھی۔ جب دھاگہ مشین میں داخل ہوا تب ایک خودکش کوّے نے ٹرانسفارمر سے گلے ملنے کی کوشش کی اور ساری فیکٹری کی مشینیں سڑ گئیں۔ میرا دھاگہ دوسری فیکٹری کو بیچا گیا۔ جو مزدور مجھے لوڈ کر رہا تھا وہ پھسل کر ایسا گرا ہے کہ گھٹنا نکل گیا۔ وہ ڈرائیور جو گاڑی لے کر جا رہا تھا اس کا ایکسیڈنٹ ہوا' اور سر پر ایسی چوٹ لگی ہے کہ وہ وہیں پاگل ہو گیا۔ موقع دیکھ کر ایک شخص دھاگہ چرا کر بھاگا اور ذرا دور جا کر ایک اندھی گولی کا شکار ہو گیا۔ دھاگہ پولیس کے قبضے میں آ گیا اور اسی دن اس تھانے میں بم دھماکہ ہوا اور سارا عملہ ہلاک ہو گیا۔ غرض 10 سال میں جہاں جہاں گیا تباہی کی داستاں چھوڑتا گیا۔ لیکن جب سیٹھ محمد طفیل ٹوکا کے ہاں پہنچا تو بننا ہی پڑا' مجھ 37397 ٹریڈ مارک نمبر ملا۔ ادلے کا بدلہ تو قانونِ فطرت ہے۔ بس یہاں سے میری سزا کا آغاز ہوا۔

وہ ٹی۔ بی کا مریض تھا۔ اس کی کھانسی سے میرا دَم گھٹنے لگتا۔ تولیے سے خاندان کی دشمنی تھی' چنانچہ نہانے کے بعد مجھے وہاں وہاں استعمال کرتا کہ میں اس کے جانے کی بعد الٹیاں کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر مَیل کہ تہیں چڑھ گئیں۔ حتیٰ کہ اب مجھے نہانے کے بعد استعمال کرتا تو پہلے سے بھی زیادہ مَیلا ہو جاتا۔ چنانچہ اس بہشتی نے نہانا ہی ترک کر دیا۔ بس صبح میرے کونے سے منہ رگڑ کر چلا جاتا۔ اکیلے میں مَیں روتا تو آنسو بھی کالے اور بدبودار نکلتے۔ مجھے اپنی شکل سے وحشت ہونے لگتی۔ مگر مَیل کی وجہ سے اس قدر چپ چپا ہو چکا تھا کہ رونگٹے بھی کھڑے ہوتے تو کسی ملنگ کے بالوں کی طرح لگتے۔ اب میرا سارا وقت اپنے گناہوں کو یاد کر کے گندے آنسو بہاتے گزرتا۔ چاندنی رات کو ٹوکا باہر نکل جاتا اور کہنے لگتا جگرتُو چاند دیکھ۔ خدا خدا کر کے گرمیاں آئیں تو یہ سوچ کر سکون ملا کہ کچھ ماہ تو کم از کم اس کے وجود سے جان چُھوٹے گی۔ مگر وہ میری سوچ سے بھی آگے نکلا۔ مجھے گدّے کی جگہ بچھا کر نیکر کے علاوہ تمام کپڑوں سے بے نیاز ہو کر اپنا متعفن وجود مجھ پر رگڑتا رہا۔ تب مجھے سردیاں تُوٹ کر یاد آئیں۔ کم از کم کپڑے تو تھے میرے اور اس ابلیس کے درمیان۔

میں نے زلزلے' سیلاب' آسمانی بجلی وغیرہ کی ہر دعا کر دیکھی' اس کا اثر مگر الٹا ہوا' اس سکھ کو خارش پڑ گئی۔ موت کی دعا بیکار تھی۔ کیونکہ اس کنجوسی کے استاد نے میری لاش کا بھی کوئی مصرف نکال لینا تھا۔ یہ دور یہی ورد کرتے گزرتا کہ' کاش میں کتا ہوتا' کاش میں کتا ہوتا' آج 5 سال بعد بھی میری سزا ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہاں البتہ اتنا اطمینان ضرور ہے کہ اس سزا کے باعث میری اگلی پچھلی سات نسلیں بخشی گئی ہیں۔

احتشام قاضی

تکمیل

اس کی کہانی بہت درد بھری تھی۔ سنتے وقت میری آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ یہ کہانی صرف اس کی نہیں بلکہ ہمارے جوان یہاں سے مایوس ہو کر تلاشِ معاش کیلئے باہر جاتے ہیں وہاں شادیاں کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے ویزے کیلئے باپ نے کتنی زمینیں بیچیں، ماں نے کتنا زیور بیچا۔ وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ یہاں ان سے وابستہ کتنے لوگ ہیں جو ان کی جھلک دیکھنے کیلئے بے تاب رہتے ہیں کوئی ہوتا ہے جو اس امید سے سوتا ہے کہ شائد وہ اس کے خواب میں آ جائیں اور جاگتے اس امید سے ہیں کہ شاید وہ لوٹ آئیں۔

وہ جب بھی لمبے سفر پر ہوتا اسے گھر اور بچوں کی فکر کھائے جاتی تھی لیکن اب کی بار گھر کی یاد ذرا نہ آئی۔ سفر کا ایک ایک لمحہ اسے صدیوں کے برابر لگ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو پلک جھپکنے میں اپنے گھر پہنچ جاتا گھڑی پر گزرتا ایک ایک سیکنڈ اس کے غم اور خوشی کی جنگ کو بڑھاتا چلا گیا۔ ماں سے ملنے کی خوشی اور کچھ انجانا سا غم جس سے اس کا دِل بیٹھتا چلا جا رہا تھا۔ ایئرپورٹ پر اترا تو وہ چاہ رہا تھا کہ اس کی ماں باہر اسکا انتظار کر رہی ہو۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا۔ وہ یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ اس کے بغیر میری ذات ادھوری ہے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر کیلئے روانہ ہوا۔ اسے یاد تھا کہ تین برس پہلے جب آخری دفعہ اس کی ماں سے فون پر بات ہوئی تھی تو اس کی ماں کتنی روئی تھی۔ اس نے کتنی بار واپس آنے کو کہا تھا۔ اللہ نے ماں بھی کیا چیز بنائی ہے جس کی محبت و شفقت سرحدوں کی مقید نہیں ہوتی۔ اور جسے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیسے جیتیں ہیں وہ مائیں جن کے جگر کے ٹکڑے ان کی نظروں سے دور اور ان کے لمس سے محروم ہوتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ٹیکسی کچی آبادی میں داخل ہوئی۔ وہاں میلے کپڑوں میں مٹی میں کھیلتے بچے دیکھ کر اسکا سارا بچپن اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہی بچے، دوستی اور کھیل لیکن چہرے بدل گئے تھے۔ وہ ٹیکسی سے نکلا وہ اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ ہمت کر کے دروازہ کھولا تو ماضی کی یادوں کے باب کھلتے چلے گئے۔ وہ چھوٹا سا صحن، ایک کمرہ، گھر کے در و دیوار چیخ چیخ کر اس سے سوال کر رہے تھے کہ آنے میں اتنی دیر کیوں کر دی وہ لاجواب بت بنا کھڑا رہا۔ اس کی ماں وہاں نہیں تھی۔ اس کا بس چلتا تو اپنی ساری دولت، عزت، مقام بیچ کر واپس ماضی میں چلا جاتا۔ وہ رونا چاہتا تھا ماں کے گلے لگ کر اچانک اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا یہ چاچا رحُو کا ہاتھ تھا۔ وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ اس نے آنکھوں میں سوال پڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

سارا راستہ دونوں بالکل خاموش رہے کچھ ہی دیر بعد وہ اولڈ ہاؤس میں

داخل ہوئے۔ بہت سے والدین اپنے پیاروں کے انتظار میں گھٹ گھٹ کر زندگی گزار رہے تھے۔ ندامت کے باعث اسے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں دھنس جائے۔ وہ جس کی آنکھیں ماں کو دیکھنے کیلئے ترس گئی تھیں ماں کے چہرے کو دیکھے بغیر قدموں میں گر گیا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ ماں کے ساتھ نظریں ملا سکے۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی ساری زندگی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر گزار دے۔ اسے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ ہاتھ کی ٹھنڈک پورے جسم میں اترتی چلی گئی۔ اس کی نامکمل ذات مکمل ہوگئی تھی۔ اس کے دِل کی خوشی اور اطمینان کی کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔

سعد احمد

شناخت

تمہاری ہمت کیسے ہوئی، میری کتابوں کو چھُونے کی؟ یہ کرخت آواز علی کی تھی، علی کی آواز سنتے ہی قاسم نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ کتاب واپس رکھ دی اور سہم کے کھڑا ہو گیا۔ اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ علی کی آواز پھر گونجی۔ نکل جاؤ میرے کمرے سے باہر، یہ سننا تھا اور قاسم اپنا سا منہ لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

علی اور قاسم تھے تو ہم عمر مگر دونوں کی زندگیوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ علی کے والد شہر کے رئیس تھے اور قاسم کے والد اس رئیس کے گھر میں مالی۔ قاسم کی ماں بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھی۔ قاسم کے والد نے اپنے اکلوتے بیٹے کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ اس کے والد اس کی دلجوئی کرتے، اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتے، رات کو سونے سے پہلے پریوں کے دیس کی کہانیاں سناتے، اور اپنے باپ کی ہی تربیت کی بدولت قاسم کی شخصیت میں نکھار پیدا ہو گیا تھا، اور باپ کی محبت اور انسانیت کے سبب اس کی فطرت میں یہ بات تھی کہ اس نے کبھی کسی ایسی چیز کی خواہش ہی نہ کی کہ جس کے حصول میں اس کے والد کو ذرہ بھر تکلیف اٹھانی پڑے۔ قاسم کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اور یہی وجہ تھی آج جب علی نے اسے اپنی کتابیں پڑھتے دیکھ کر ڈانٹا تو اُس کا دل بہت دُکھا۔ وہ واپس اپنے کوارٹر میں آ کر بستر پر اوندھا لیٹ گیا اور گھنٹوں اپنی قسمت پر روتا رہا اور روتے روتے نجانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی، اور اُس کی آنکھ اُس وقت کھلی جب اُس کے والد اُس کے سرہانے بیٹھے اس کا ماتھا اور بال سہلا رہے تھے۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں، جب والد نے وجہ دریافت کی تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا مگر اس نے اس سیلابی ریلے کو آنکھوں کی حد پار نہ کرنے دی اور ہمت کر کے بولا ''بابا

کچھ نہیں بس سر میں درد کی وجہ سے آنکھوں میں بھی درد تھا۔ مگر اب سب ٹھیک ہے''۔ قاسم کو پتہ تھا کہ اس کے والد کی قلیل آمدنی میں کس طرح مشکل سے ان کا گزر بسر ہوتا ہے اور پھر بابا کی ٹی بی کی دوائیاں بھی لینی ہوتی ہیں تو اِس لیے چاہتے ہوئے بھی اس کے والد اسے سکول نہیں بھجوا سکتے۔

گردش لیل ونہار، بندش ماہ وسال دن رات کا ہیر پھیر کرتے رہے اور قاسم سولہ برس کا ایک خوبرو جوان بن گیا۔ والد کی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے اُس نے ان کی جگہ کام شروع کر دیا اور آج رئیس کے بنگلہ میں کافی چہل پہل تھی بنگلے کو برقی قمقموں سے سجایا گیا تھا اور ہر طرف گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں۔

علی کے والد حاکم خان کو قومی اسمبلی کی نشست کی پارٹی ٹکٹ ملی تھی اور چند ہفتے بعد انتخابات بھی تھے سو حاکم خان نے یہ پارٹی آنے والے انتخابات کی تیاری اور شہر میں اپنے ووٹرز کو خوش کرنے کے لیے رکھوائی تھی کیونکہ دوسری طرف حاکم خان کے مخالف راجہ سکندر نے بھی انتخابی تیاریاں بڑے زوروشور سے شروع کر رکھی تھیں۔

قاسم بڑی مستعدی اور پھرتی سے مہمانوں کی خدمت میں مصروف تھا۔ حاکم خان تو ویسے بھی قاسم کو اس کے بچپن سے ہی جانتا تھا اور آج اسے اس طرح کام کرتے دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ اسے انتخابات کے لیے اور سارے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ویسے بھی کسی جوان شخص کی ضرورت تھی جو دن رات ایک کر کے اس کے لیے کام کرے چنانچہ رات کو فارغ ہو کر اس نے قاسم کو اس کام کی پیش کش کی۔ قاسم پیش کش سن کر بہت خوش ہوا، اس نے سوچا کہ وہ انتخابات میں حاکم خان کے لیے کام کرے گا اور وہ اسے کسی اچھے سے سکول میں داخل کروائے تا کہ اس کا تعلیم حاصل کرنے کا سپنا پورا ہو جائے۔ قاسم کو تو اس رات جیسے اپنی شناخت مل گئی تھی۔

انتخابات کے دن نزدیک آتے گئے اور قاسم جان مار کر حاکم خان کے لیے کام کرتا رہا، آج شہر میں دونوں جماعتوں کی انتخابی ریلی تھی، مخالفت کی وجہ سے لڑائی جھگڑے کا بہت خدشہ تھا۔ دونوں جماعتوں کی ریلی شہر ایک ہی جگہ پر اختتام پذیر ہونا تھی اور وہ جگہ شہر کے عین وسط میں تھی۔ اس جگہ پر پولیس کی بھاری نفری تعینات تھی۔ مقررہ وقت پر ادھر سے حاکم خان کے حامیوں کا جلوس اُمڈ آیا جس میں قاسم سب سے آگے آگے ''حاکم خان زندہ باد'' کے نعرے لگاتا ہوا عوام کا جوش وخروش بڑھا رہا تھا اور دوسری طرف سے راجہ سکندر کے حامی اس کے حق میں نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

اختتام کی جگہ پر پہنچ کر دونوں طرف سے نعرے بازی اور بڑھ گئی اور پھر بات ایک دوسرے کو گالی گلوچ اور پھر ہاتھا پائی تک جا پہنچی، قاسم نے لڑائی جھگڑا رکوانے کی بہت کوشش کی مگر لوگ بہت زیادہ تھے، جب لڑائی مزید بڑھی اور توڑ پھوڑ شروع ہوئی تو پولیس نے آنسو گیس کے شیل پھینکے اور ہوا میں فائرنگ کی، اس سے لوگ منتشر ہو گئے مگر اُسی اثنا میں پولیس کی ایک اندھی گولی قاسم کے سینے کے آر پار ہو گئی اور وہ موقع پہ ہی دم توڑ گیا اور عقب میں بھاگتے ہوئے لوگ ابھی تک نعرے لگا رہے تھے، ''حاکم خان زندہ باد، حاکم خان زندہ باد۔۔۔۔۔۔۔''

محمد عثمان اختر

نادرہ

آج پھر صبح سویرے سے ہی دفتر کے باہر لمبی قطار لگ گئی تھی' دھوپ ایسی سخت تھی کہ تر ہونے کے لیے دو منٹ بہت تھے۔ کبھی بادل کا ٹکڑا آسمان کی چادر کو تھوڑی دیر کے لئے آسمان سے چھپا دیتا تو قطار میں کھڑے لوگ صد بار خدا کا شکر ادا کرتے۔ ان میں بھانت بھانت کے لوگ تھے' بوڑھے' جوان' عورتیں' بچے... بچے اور جوان جو اٹھارہ سال سے زائد عمر کے تھے کیونکہ یہ قطار نادرا کے دفتر کے باہر لگی ہوئی تھی جس کی طوالت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا اور چند مزید گھنٹوں میں عین ممکن تھا کہ یہ قطار سڑک کے دوسرے کنارے جا پہنچتی۔

دفتر کے اندر کی صورتحال قدرے مختلف تھی' اربابِ محکمہ کے اجسام ایئر کنڈیشنر کے باعث باہر سے اندر آنے والوں کے لیے اب برف کا کام دے سکتے تھے۔ یہ دور سے ہی بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے پر جملے کستے' ہنستے' مسکراتے اپنا کام نمٹا رہے تھے جو کہ باہر سے آنے والوں کو بہت بُرا لگ رہا تھا۔ کئی ایک تو غصے میں آ کر کرسی پر براجمان صاحبان کو گھوری سنا دیتے مگر پھر کیا ہوتا؟ قطار میں کھڑے افراد کو مزید انتظار کرنا پڑتا کیونکہ یہ صاحبان روٹھ سے جاتے اور آدھ گھنٹے تک اگلے کسی بندے کو اندر نہ بلاتے۔ ان صاحبان میں ایک کلیم بھی تھا جس کے چہرے کی بشاشت روز افزوں تھی' وہ وہاں بیٹھتا تھا جہاں لوگوں کا نام وغیرہ معلوم کر کے کمپیوٹر کے ذریعے ان کا ٹوکن بنایا جاتا تھا۔ اُس نے اِس کام میں کبھی دلچسپی نہ لی تھی' اور اگر کوئی مدّعی اُس پر لمبی تقریر جھاڑتا تو وہ جوابی کارروائی سے نہ چوکتا اور بے نقط سناتا کہ ہم بھی دن بھر کے ستائے ہوئے ہیں' ہمیں شوق نہیں کہ کام تاخیر سے ہو' کیا ہم انسان نہیں؟ ایک آپ ہی مظلوم جہان بھر کے ہیں؟ ہماری بھی پریشانیاں ہیں... اور جب اگلا بندہ یہ تیور دیکھ کر چپ ہو جاتا تو یہ بھی اپنی فتح سمجھ کر خاموش ہو جاتا اور پھر اگلے ایک گھنٹے تک کسی کی عرض نہ سنتا' اس کو تو اس کے باپ نے زبردستی' سفارش کے ذریعے اس محکمے میں بھیج دیا تھا ورنہ اسے روز نئی شکلیں دیکھنے سے کچھ شغف نہ تھا... وہ چہرے جن سے ہر سمت بیچارگی نظر آتی تھی' جن کی صورتیں سوال تھیں' جن کی آنکھیں ننگی تھیں' جن کے سینے عریاں تھے' جن کے چہرے پر پسینے کی مقدار بتاتی رہتی تھی کہ جب یہ آئے ہوں گے تو قطار کتنی لمبی ہو گی... تھیں' جن

اسے تو بچپن سے ہی آرٹ میں دلچسپی تھی' عجیب قسم کے نقش و نگار بُننا اور پھر گھنٹوں اسے تکنا کہ یا اللہ یہ میں نے کیا شاہکار بنا چھوڑا ہے' یہ آڑی ترچھی لکیریں اگلے برسوں میں گنج پائے گراں مایہ ہوا کریں گی' ان کی قیمت وہ ہو گی کہ مغل دربار کے ہدیے کم پڑ جائیں گے' ہائے ری قسمت! ایسا تو کچھ بھی نہ ہو سکا کیونکہ معمولی سی تعلیم کے بل بوتے پر اس کے باپ نے اسے یہاں لا چھوڑا تھا اور پھر شادی بھی کر دی کہ یہ ذمہ داریاں اس کا نقطۂ حیات بدل دیں گی' اور شاید ایسا ہوا بھی تھا کیونکہ جب شام میں وہ تھکا ہارا گھر آتا تو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھانا ہی محال ہو جاتا' نقش نگاری کے باب تو شاید ہی وا ہو پاتے۔

اس کے لیے اب لوگوں کے چہرے ہی تمام نقوش ہو چکے تھے' وہ کبھی کبھار کسی آدمی کو دیر تک دیکھتا تو اسے خود سے گھِن آنے لگتی' اسے قدرت کے نقوش کچھ پسند نہ تھے ... وہ سوچتا کہ اگر اس کے ہاتھ میں لوگوں کی صورتیں بنانے کی ذمہ داری عائد کر دی جاتی تو وہ تمام انسان یوسفؑ کے سے بناتا' یہاں تک کہ کسی انسان کو کسی دوسرے سے نفرت نہ ہو سکتی' جب وہ لوگوں سے ان کے نام پوچھتا تو وہ خود سے بہت کچھ فرض کر لیتا' وہ بہت کچھ کہ ایک لمحے کو اسے خود سے نفرت ہو جاتی۔ وہ روز ایک سے نقوش ونشانات دیکھ کر اب تنگ آ گیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اب اس کے پاس انسان نہیں بلکہ جانور شناختی کارڈ بنوانے آیا کریں' جو جنگلوں میں بے نام زندگی گزار رہے ہیں' جو چڑیا گھر میں مقید پڑے ہیں... کوئی ہاتھی آئے جس کی سونڈ کا ترچھا سا ''کرو'' (Curve) وہ گھنٹوں تک دیکھ سکے اور پھر گھر آ کر تمام تھکن کے باوجود اسے کاغذ پر اپنے ہاتھوں سے یوں ثبت کر دے کہ دنیا والوں کی نظریں جوں کی توں رہ جائیں' کوئی سانپ یا ناگ آئے جس کا بل کھاتا جسم وہ چھو سکے اور پھر ذہن میں محفوظ کر کے جب کبھی اداس ہو تو نظروں میں لا کر جی کو بہلائے' کوئی گیدڑ' کوئی ریچھ' کوئی شیر' کوئی گینڈا' کوئی کینگرو' کوئی تیندوا' کوئی لومڑی... کوئی بھی بجز انسان۔

اس نے اپنی اِن عجیب وغریب خواہشات کا اظہار کسی سے نہیں کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا اس کی بات سمجھنے والا کوئی نہیں ہے' یہ نقوش وآیات کا جہان اس کے لیے کچھ اور ہی تھا۔ مگر اس کی یہ سوچ ذہن کے کسی گمنام خاکے میں پریشان ہو کر رہ گئی جب اس کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہونے کو تھی' اس کی زندگی میں جب کوئی مہمان داخل ہونے کو تھا' اس کے لیے دھوپ سایہ ہو چکی تھی' قطار میں کھڑے لوگ اسے رقصاں نظر آتے تھے' جب اس کا جسم ایک ہی کرسی پر بیٹھ بیٹھ کر یوں دُکھنے لگتا کہ جیسے چھت کے تمام پنکھے اس کے جوڑ جوڑ پر آ گرے ہیں تو وہ نئے مہمان کا سوچ سوچ کر جی بہلاتا...

اور جب وہ اس دنیا میں آ گئی تو اس کا جی کیا کہ وہ سارے جہان کو اپنی خوشی بتائے' ہوا میں اتنے نقش مہر کر لے جن کی ضیا سے رات بھی دن معلوم ہو۔ فرطِ مسرت کا یہ عالم تھا کہ وہ ساری رات جاگتا رہا۔ ناشتے پر جب اس کی بیوی نے کہا کہ اماں کہتی ہیں خدیجہ نام رکھ دو تو وہ مسکرانے لگا اور کہا میری بیٹی کا نام اتنا عام سا نہ ہوگا' وہ تو یوں ہوگا کہ جو سنے پھر سے پوچھے کہ کیا کہا؟ اور دفتر میں آ کر بیٹھ رہا۔

وہ اب قطار میں کھڑے لوگوں کو زیادہ انتظار نہ کراتا' انہیں جلد سے جلد اندر بلاتا تاکہ زیادہ سے زیادہ عورتوں کے نام جان سکے۔ جب دفتر داخل ہوتے وقت وہ دیکھتا کہ عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد مردوں کی ایک تہائی بھی نہیں تو بجھ کر رہ جاتا اور دعائیں کرتا کہ یہ چند ایک ہی ایسے ناموں کی مالک ہوں کہ جی خوش ہو جائے۔ اس نے لوگوں کو کبھی اتنی خوش خلقی سے جواب نہ دیا تھا کہ جیسے آج کل وہ دے رہا تھا' سب اس کے اس رویے سے حیران تھے...

پہلے دن صرف ایک عورت ایسی آئی جس کا نام مختلف تھا' اس کی آنکھوں سے بیچارگی اور کسمپرسی کے وہ آثار واضح تھے کہ کلیم نے پہلی نظر کے بعد اسے دوبارہ دیکھنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ مگر اس کا نام اسے پسند آ گیا تھا۔

''اس کا مطلب کیا ہے؟'' اس نے نام جاننے کے بعد پوچھا۔

''پرنیاں ریشم کا وہ باریک کپڑا ہوتا ہے جو با آسانی آگ پکڑ لیتا ہے...''

اس کی مہین آواز سے اُسے پرنیاں پر نہایت ترس آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بس اب ڈھے جائے گی۔

نام کا مطلب بھی اسے بھا گیا تھا مگر جب وہ ہاتھوں کے پرنٹ دینے کے لیے فاخرہ کے پاس گئی تو فاخرہ اس سے باتیں کرنے لگی جسے کلیم لاشعوری

میں سننے لگا۔ ''پھر آگے کیا ہوا؟''۔ فاخرہ نے پوچھا۔

''پھر کیا؟ تیسری بیٹی کے بعد میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی...''

اس نے مشکل سے مسکرا کر کہا اور کلیم کو یوں لگا جیسے اس کی روح قبض کر لی گئی ہو۔ ''ہرنیاں'' نام اس کے جی سے اتر گیا۔

اگلے دن سروش نامی لڑکی ٹوکن بنوانے آئی تو کلیم کا چہرہ خوشی سے کھِل اٹھا۔ ''اس کا مطلب؟''۔ کلیم نے اس سے پوچھا جب وہ اپنی زلفیں سنوار رہی تھی' اس کے چہرے پر غیر معمولی کشش تھی بھنویں تنی ہوئیں اور لباس تنگ...

''فرشتہ'' اس نے بہت ادا سے کہا۔ کلیم کو اس کا یہ انداز بہت ناگوار گزرا۔ نام تو اسے بہت پسند آیا تھا مگر لڑکی کی شخصیت اسے متاثر نہ کر سکی۔ قطار میں بھی وہ بے ہنگم انداز سے کھڑی پائی گئی تھی۔ جب کلیم نے اسے ٹوکن تھمایا تو اُس نے چنگاری بھری نظروں اور معنی خیز مسکراہٹ سے کلیم کی طرف دیکھا۔ کلیم نے نظریں جھکا لیں۔ ''سروش'' نام کا اس پر کلیم کو ذرہ بھر بھی اثر نظر نہ آیا۔ یہ نام بھی اسے رد کرنا پڑا۔

دو دن بعد درخشاں' نامی عورت نے اسے متاثر کیا' مگر اس کی ناک سے کلیم کو سخت وحشت ہوئی' اس نے جلدی سے اسے ٹوکن بنا کر دیا تا کہ اس وحشت سے دور ہو سکے' یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے آرے سے اس کی ناک کاٹ دی تھی۔ جب وہ انتظار کرنے کو بیٹھی تو دوسری عورت سے باتیں کرنے لگی جسے کلیم سننے لگا۔

''ایک دن میں اُن کا سر نہ داب سکی کیونکہ منّے کو سخت بخار تھا تو غصے میں آ کر انہوں نے چھری سے میری ناک کاٹ دی۔'' درخشاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''خدارا رحم! یہ بھی لحاظ نہ کیا کہ قرآن کی حافظہ ہو' اللہ کی مار ہو کم ذات پر۔'' دوسری عورت نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ کلیم کی ٹانگوں سے طاقت معدوم ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ قطار میں کھڑے' گرمی سے دہکتے تمام مردوں کو سَو سَو گھونسے مارے اور پھر جواباً سب اسے ماریں یہاں تک کہ وہ جان دے دے۔

شام میں 'مسرور' نامی کم عمر لڑکی کی معصومیت اور نام دونوں نے اسے متاثر کیا' اس کو لگ رہا تھا اس کی بیٹی بھی بڑی ہو کر ایسی ہی دل نشیں اور دوشیزہ بنے گی' یکدم اسے اپنی بیوی کا خیال آیا جس نے ناشتے پر اسے ''زہرہ'' نام رکھنے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ قائل نہ ہوا۔ ''نام رکھوں گا تو صرف میں...'' اس نے ڈٹ کر کہا۔ اور اب وہ چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد کوئی اچھوتا سا نام رکھ لے۔ 'مسرور' نام جلد ہی اسے ذہن سے جھٹکنا پڑا جب فاخرہ کے استفسار پر اس نے بتایا کہ پچھلے سال اس کی ساس نے حمل کے دوران اسے اتنا مارا کہ اس کا بچہ مر گیا۔

قطار میں جوں جوں عورتوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی' توں توں کلیم کا دماغ مزید الجھنوں کا شکار ہوتا جا رہا تھا' اس کو اب معلوم ہو رہا تھا جن چہروں کے نقوش اُسے پریشان کیے رکھتے تھے۔ وہ اندر سے کتنے بودے اور مظلوم تھے... اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جن درندوں کے انتظار میں وہ تھا' وہ تو نامعلوم عرصے سے اس کے پاس آ رہے تھے... اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ نام کسی توجہ کے حامل نہیں' وہ ثریا ہو یا عمارہ' وہ نحل ہو یا درشہوار' وہ سروپ ہو سروش' وہ ثمانیہ ہو یا ندرت' وہ مقدس ہو یا مسرت... یہ ماں باپ کی تربیت ہے جو انہیں درندگی اور مظلومیت میں سے کسی ایک راہ پر گامزن کرتی ہے۔ بہت سارے ناموں سے آشنا ہونے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ نام اس کی بیٹی کو کچھ نہ دے سکے گا' قسمت اللہ سے ہے اور تربیت ماں باپ سے!

اگلی صبح جب اس کی بیوی نے کہا ''کلیم دو ہفتے ہو گئے' کیا نام سوچا تم نے؟'' کلیم نے سر جھکا کر کہا۔ ''نادرہ''۔

اسد طارق

غلط راستہ

رات بہت ہو چکی تھی' تقریباً بارہ ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا' اسٹیشن مسافروں سے بھرا ہوا تھا' تھکے ہارے مسافر زمین پر دریاں بچھائے لیٹے پڑے تھے۔ ریل گاڑی کا شدّت سے انتظار ہو رہا تھا۔ یہ ریل گاڑی مسافروں کو راول پنڈی سے لاہور لے کر جانے والی تھی۔ چونکہ وقت رات کا تھا' لہٰذا رش دن کے اوقات سے قدرے کم تھا' مگر پھر بھی مسافروں کی ایک بڑی تعداد پلیٹ فارم پر موجود تھی اور زمین اور بینچوں پر آرام فرما رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں کچھ دُور سے ریل گاڑی کے ہارن کی آواز آئی' جو کانوں میں پڑتے ہی لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور سامان سنبھالنے لگے۔ جلدی جلدی سب کچھ سمیٹا جانے لگا۔ ریل گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی اور اُس کے رُکتے ہی لوگ اُس کے اندر گھسنے لگے۔ اس افراتفری میں کسی کو داخلی اور خارجی دروازے کی تمیز نہ رہی۔ جو بھی دروازہ قریب پڑا' اُس میں گُھسنے لگے۔

جب بڑی تعداد میں مسافر ریل گاڑی میں گُھس چکے تو پلیٹ فارم کی دیوار سے سہارا لیے کھڑا ایک آدمی گاڑی کی طرف لپکا' اپنی بوگی تلاش کی اور داخلے کے دروازے کے ذریعے ریل گاڑی پر چڑھ گیا۔ وہ آدمی عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا۔ متوسط قد' ہلکے بھورے بال' جو سَر کے گرد موجود تھے۔ آنکھیں کچھ دھنسی ہوئیں۔ مونچھیں نہ ہونے کے برابر' منہ میں کچھ ہی دانت بچے تھے اور ہونٹ پان چبانے کے باعث کچھ لال تھے۔ بوگی میں گُھسنے کے بعد وہ ٹکٹ پر سے پڑھ کر اپنی سِیٹ ڈھونڈنے لگا۔

آخر جب وہ اپنی سِیٹ پر پہنچا' تو دیکھا کہ وہ سِیٹ پہلے ہی ایک خاتون نے قابو کر رکھی تھی۔ اُس نے خاتون کو اپنا ٹکٹ دکھایا تو خاتون کچھ پریشان سی ہوئی۔ اپنا ٹکٹ نکال کر دیکھا تو ندامت چہرے پر پھیل گئی' اور وہ اپنا سامان اُٹھا کر چل دی۔ آدمی کا اپنا سامان کچھ زیادہ نہ تھا۔ بہرحال' اُس نے سامان اوپر سٹینڈ پر رکھا اور آرام سے اپنی سِیٹ پر لیٹ گیا۔

جب مسافر اندر آ چکے تو گاڑی ایک ہارن کے ساتھ حرکت میں آئی۔ ذرا چلنے لگی تو ایک لڑکا نہایت احتیاط سے اپنا سامان آرام آرام سے لاتا ہوا اُس بوڑھے آدمی کے ساتھ والی سِیٹ پر آ پہنچا۔ اُس آدمی کو دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ آدمی نے اُس کی پریشانی محسوس کی اور کچھ ہمت بندھانے کے لئے بولا:۔

''آیئے آیئے برخوردار۔''

لڑکا کچھ گھبراتا ہوا آگے بڑھا۔ ابھی بھی اُس کو اطمینان نہ ہوا۔ کچھ ڈرتا ڈرتا آگے بڑھا اور نہایت سنبھل سنبھل کر اپنا سامان اوپر رکھنے لگا۔ سامان رکھنے میں لڑکے کی احتیاط کافی غیر معمولی تھی۔ چنانچہ بوڑھے آدمی نے پوچھا:۔

''کیا ہوا؟''

''جی... جی کچھ نہیں۔'' لڑکا بہت گھبرا گیا۔

''نہیں وہ آپ کا سامان...''

''سامان کیا؟'' لڑکے نے چونک کر پوچھا۔

''شاید کچھ دقت ہو رہی ہے''

''نہیں وہ...''

''کچھ قیمتی سامان لگتا ہے''

''نہیں تو... قیمتی تو... نہیں نہیں''

''پھر؟ بھاری ہے؟ یا کانچ وغیرہ کی کوئی چیز...''

''ہاں ہاں... (آدمی کی بات کاٹتے ہوئے) کانچ... کانچ کا...''

''مَیں مدد کروں؟''

''جی نہیں... شکریہ! بس ہو گیا...''

یہ کہہ کر لڑکے نے سامان رکھا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لڑکا کم و بیش پچیس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ چہرہ گھبراہٹ کے مارے بے حس سا تھا۔ داڑھی چھوڑ رکھی تھی۔ سر پر ایک نماز والی ٹوپی بھی موجود تھی اور وہ سفید کُرتا شلوار میں ملبوس تھا۔ ایک کالے رنگ کا چھوٹا سا بیگ اُس کے ہاتھ میں بھی تھا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اُس آدمی کو گھورنے لگا۔ آدمی نے بیگ ہاتھ میں دیکھا اور کہا۔

''یہ بیگ...''

''ہاں؟...'' لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں نے کہا یہ بیگ شاید رکھنا بھول گئے ہو اوپر''

''اوہ... ہاں... مگر...''

''خیر چھوڑو اِسے یہیں رکھ لو بیچ میں۔'' آدمی نے بیگ لڑکے سے لیا اور بیچ میں رکھ دیا۔ اِس سب کے دوران ریل گاڑی اپنی معمول کی رفتار پکڑ چکی تھی اور رواں دواں تھی۔ آدمی اُسی لڑکے پر غور کیے جا رہا تھا اور اُس کے برتاؤ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اب بھی اُتنا ہی بوکھلایا ہوا تھا۔

چکلالہ اسٹیشن آ پہنچا۔ گاڑی تھوڑی دیر کو ٹھہری۔ اِس دوران بوڑھے آدمی نے لڑکے سے بات چیت شروع کرنا مناسب سمجھا۔

''میرا نام اکرم ہے۔'' بوڑھے آدمی نے کہا۔

''جی؟... اچھا اچھا۔''

''بیٹا، تمہارا کیا نام ہے؟''

''جی میرا؟ میرا نام...؟''

''ہاں ہاں، تمہارا نام''

''علی...''

''علی؟ ماشاءاللہ بڑا پیارا نام ہے۔''

''جی شکریہ۔''

''رہتے کہاں ہو؟''

''مَیں... یہیں پنڈی میں...'' لڑکا اب بھی ہچکچا رہا تھا۔

''علی بیٹا، خیریت ہے...؟''

''ہاں... جی... خیریت ہے۔''

''تو اتنا ڈرے ہوئے کیوں ہو؟''

''وہ بس ایسے ہی...''

''پہلی بار سفر کر رہے ہو کیا؟''

''وہ کیا؟''

''بس کچھ نہیں۔'' علی کو اکرم کی بلاوجہ مداخلت پسند نہ آئی۔

''اوہو۔ لگتا ہے آپ بات نہیں کرنا چاہتے۔ چلیں ٹھیک ہے''

ریل گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ اتنے میں اُن دونوں کے سامنے والی سیٹوں پر ایک نوبیاہتا جوڑا آ کر بیٹھ گیا۔ اکرم اور علی، دونوں کا دھیان کچھ

دیر کے لیے ایک دوسرے سے ہٹا۔ اکرم بہت ہی سادہ لوح قسم کا انسان تھا جسے زیادہ بولنے کی عادت تھی۔ علی کی طرف سے بے رخی دیکھ کر وہ اُس جوڑے سے گفتگو کرنے لگا۔

''السلام علیکم!''

''جی' وعلیکم السلام'' دونوں میاں بیوی نے ایک ساتھ جواب دیا۔

''ماشااللہ' بڑی خوب جوڑی ہے آپ دونوں کی۔ شادی آج ہی ہوئی کیا؟''

''جی بس ابھی'' دولہے نے کہا۔

''تو بھئی اتنی جلدی کہاں چل دیئے؟''

''جی وہ لاہور... وہ اصل میں ...''

''جی...''

''اصل میں میرے والد اور والدہ لاہور ہی ہیں۔ اُن کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی' اِس لیے ہم اُنہیں دیکھنے جا رہے ہیں۔'' دُلہن نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

چاروں کے درمیان کچھ دیر کے لیے خاموشی سی رہی۔ وہ بوڑھا شخص گھور گھور کر دونوں میاں بیوی کو دیکھنے لگا۔ دونوں کے سر یک دم جُھک گئے۔ دُلہن ایسے نادم ہوگئی جیسے وہ کچھ ایسا بول گئی ہو جو اُسے نہیں بولنا چاہئے تھا۔

''تو تم دونوں نے بھاگ کر نکاح کیا ہے؟'' اکرم نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ شوہر اپنی بیوی کو غصّے سے دیکھنے لگا۔

''بولو نا! کیا ہُوا؟'' اکرم نے پھر سے معاملے میں اپنی دلچسپی ظاہر کی۔

''وہ جی...'' شوہر نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔

''ارے کیا' وہ جی' وہ جی' لگا رکھا ہے'' اکرم بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''بیٹا نام کیا ہے تمہارا؟''

''جی وہ...'' شوہر پھر گھبراتے ہوئے بولا۔

''ارے بھئی نام ہی تو پوچھا ہے۔ گھبراتے کیوں ہو بھائی؟'' علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا'' اِن سے نام پوچھا تو یہ گھبرانے لگے' آپ سے پوچھا تو آپ بھی۔ ارے گھر سے بھاگے بھی تو کیا ہوا؟ میں کون سا پرچہ کٹوا رہا ہوں تمہارے خلاف۔ ہاہا'' (اکرم ہنسنے لگا)

''جی وہ... میرا نام محمد نعمان ہے۔ اور یہ میری زوجہ ہیں قراۃ العین۔''

''ماشااللہ ماشااللہ! تو کہیے جناب' بھاگے تھے کیا؟''

''اصل میں وہ...'' عینی بولی'' السلام علیکم''

''وعلیکم السلام بیٹا۔ بولو بولو...''

''جی اصل میں میرے گھر والے راضی نہیں تھے اِس رشتے سے۔ اور جس سے وہ میری شادی کرانا چاہتے تھے' اُس کو نہ میں پسند تھی' نہ مجھے وہ۔ زبردستی کی شادی سے بہتر مجھے لگا کہ بھاگ جاؤں۔''

''اچھا۔ تو؟''

''تو میں بھاگ آئی۔''

''بڑا معرکہ مارا بھئی تم نے۔ لیکن ہوا کیا پھر؟ اس کے ماں باپ مان گئے بھگوڑی بہو سے؟''

عینی خاموش ہوگئی اور کن اکھیوں سے نعمان کو دیکھنے لگی۔

''کیوں نعمان بیٹا؟ میں کچھ پوچھ رہا ہوں'' اکرم نے نعمان کو دیکھ کر پوچھا۔

''میں نے... وہ...'' نعمان کچھ بولنے کی کوشش کرتا رہا۔

''ارے برخوردار' گھبراتے بہت ہو تم۔ تمہاری طبیعت دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ تم والدین کی مرضی کے خلاف چلے ہو گے۔''

''جی وہ تو ابھی تک جانتے ہی نہیں ہیں۔'' نعمان آخر کار ہمت کر کے بول پڑا۔

''سبحان اللہ! واہ بھئی'' اکرم بڑے مزے سے بولا۔ ''مطلب یہ کہ ایک

فریق وہ ہیں' وہ ڈنکے کی چوٹ پر بھاگ آئے اور دوسری طرف وہ صاحب بہادر ہیں جو خود ہی گھر سے کھسک لیے۔ نہ کسی سے پوچھا' نہ کسی کو بتایا۔''

''اِس کا وقت ہی کہاں ملا'' عینی بولی۔

''کمال ہے! بھاگنے کے لیے وقت تھا تمہارے پاس' اور اِن کے پاس بتانے تک کا بھی وقت نہیں تھا۔ ویسے بھی تم تو لاہور سے...''

اکرم کہتے کہتے رُک گیا۔ کچھ پل مزید دونوں کو گھورنے کے بعد بولا:۔

''ارے تم تو لاہور سے ہو عینی بیٹا' اور یہ پنڈی سے...''

''اسلام آباد'' نعمان بیچ میں بول پڑا۔

''ہاں حرکتیں تو اسلام آبادیوں والی ہی ہیں تمہاری۔ خیر' اب کم ''لاہوری پنا'' تو اِس خاتون نے بھی نہیں دکھایا۔'' اکرم نے سانس لی۔ ''اچھا تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ لاہور کی اور تم اسلام آباد کے تو یہ تعلق ہو کیسے گیا تم دونوں کا؟''

''پیار کا کیا ہے جی' بس ہو گیا۔'' نعمان مسکرا کر بولا۔

''اجی پیار ہی ہے' مچھر تو نہیں۔ ایسے ایک شہر سے دوسرے شہر... واہ بھئی۔''

اکرم سامان میں سے پاندان نکالنے لگا۔ ''اتنا تیز تو ڈینگی بھی نہیں پھیلتا۔''

عینی مسکرائی۔ اکرم نے پان اپنے منہ میں ڈالا۔ نعمان اور عینی سے بھی پوچھا مگر انہوں نے شکریہ کہہ کر پان لینے سے انکار کر دیا۔ علی کی طرف پاندان بڑھایا تو دیکھا کہ علی کھڑکی سے باہر منہ کر کے کچھ اُداس بیٹھا ہے۔ ایک دو بار آواز بھی دی' پھر ایک تھپکی لگائی تو وہ گردن موڑ کر اکرم کو گھورنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اکرم نے ایک اور بار پکارا مگر جواب ندارد۔ پھر اکرم بولا:۔

''ارے میاں ہوش میں تو ہو؟ نشہ کر کے بیٹھے ہو کیا؟''

ایک کپکپی سی علی کے جسم میں دوڑ گئی۔

''جی جی۔ کیا ہوا؟''

''میں نے پوچھا نشہ کر بیٹھے ہو؟''

''نہیں وہ... خیر... کوئی بات؟''

''ہاں بس پان کھا رہے تھے' سوچا تمہیں بھی پوچھ لیں...''

''اپنے کام سے کام نہیں رکھ سکتے آپ؟'' وہ انتہائی غصے سے اکرم پر چلّایا

''ارے بھئی حوصلہ کرو۔ بزرگ ہیں۔'' علی کا بازو پکڑ کر نعمان نے سمجھایا۔

''اپنا ہاتھ ہٹاؤ۔ چھوڑو مجھے''

نعمان نے فوراً ہاتھ ہٹایا اور پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

''ارے چھوڑو میاں' شرافت کا زمانہ کہاں رہا۔'' یہ کہہ کر اکرم نے اپنا پاندان بند کیا اور واپس سامان میں رکھ دیا۔

''تو بولو' کیسے مِلے؟''

''جی وہ فیس بک...'' عینی بولی۔

''ہیں؟ کیا؟'' اکرم کو سمجھ نہ آ سکی۔

''وہ انٹرنیٹ کا کہہ رہی ہیں۔'' نعمان نے سمجھایا۔

''ان کی کہی اب تم ہی سمجھو میاں۔ تمہارا سامان ہے۔ اور عجیب بات تو یہ ہے کہ سمجھ نہیں آتی مجھے' کہ تم لوگوں کو انٹرنیٹ پر یہ پیار ہو کیسے جاتا ہے۔''

''بس یہ آج کل کے زمانے کی باتیں ہیں۔ آپ کہاں سمجھیں گے۔''

''ہاں میاں! یہ تو سچ کہا تم نے۔ ہمارے ہاں کہاں رواج تھا اس بھاگ دوڑ کا۔ شادیاں کرائی جاتی تھیں۔ لڑکیاں نہیں بھگائی جاتی تھیں۔''

''جی جی''

''لیکن میں کون ہوتا ہوں تمہیں سمجھانے والا؟ میرا تو خود کا بیٹا...''

اکرم چپ ہو گیا۔ ایک بار پھر چاروں کے بیچ سناٹا چھا گیا۔ دونوں میاں

بیوی حیران ہو کر اکرم کا چہرہ تکنے لگے۔ اس بات پر علی بھی متوجہ ہو گیا۔ تینوں کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئے اور اکرم سر جھکائے بیٹھا رہا۔ آخر کار بولا:۔

''ہاں! میرا بیٹا بھی بھاگ گیا تھا گھر سے۔''

''اور اسلام آبادی ہونے کے طعنے مجھ پر...'' نعمان طنزیہ انداز سے بولا۔

''ارے تمہاری طرح نہیں بھاگا تھا وہ گھر سے چھپ کر شادی کرنے کے لئے۔'' اکرم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''تو آپ نے روکا کیوں نہیں؟'' عینی بولی۔

''ارے اتنا وقت ہی کہاں ملا۔ اتنا ہوش ہی کہاں تھا کسی کو۔ رات کے اندھیرے میں چل نکلا۔ نہ گھر والوں کا سوچا' نہ خود اپنی کم عمر کا۔''

''کم عمر؟ کتنے سال کا تھا وہ؟ عینی نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

''پندرہ سال کا۔'' یہ کہہ کر اکرم نے گہری سانس لی' اور پھر اپنا سر جھکا لیا۔

''ہائے بے چارہ! یا خدایا!'' عینی تڑپ کر بولی۔

''ہوا کیا تھا؟ بتانا پسند کریں گے؟'' علی نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

''کہانی بہت لمبی ہے''

''اڑھائی گھنٹے تو کم سے کم ہیں ہمارے پاس ابھی۔'' علی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

''جی ضرور سنائیے آپ بھی اپنے بھگوڑے کی کہانی'' ہنستے ہوئے نعمان نے کہا۔

''شرم کرو'' عینی نے نعمان کو گھور کر کہا۔ پھر اکرم کی طرف واپس متوجہ ہو کر بولی ''آپ شروع کریں۔''

''اچھا! پانی ملے گا ذرا؟''

''جی ضرور۔'' یہ کہہ کر عینی کھڑی ہوئی اور سامان سے پانی کی بوتل نکالنے لگی۔ اکرم علی کو دیکھ رہا تھا۔ اِس کے بیٹے کی کہانی میں علی کی غیر معمولی دلچسپی پر حیران ہو رہا تھا۔ گلاس میں پانی ڈال کر اکرم کی طرف بڑھایا اور عینی بولی:۔

''یہ لیجئے''

''بہت شکریہ!'' پانی پی کر گلاس واپس کرتے ہوئے اکرم بولا ''جیتی رہو بیٹا!''

''جی کوئی بات نہیں۔ اب شروع کریں!'' عینی واپس اپنی جگہ پر بیٹھ کر بولی۔

''عبدالجبار نام ہے اُس کا...''

دونوں میاں بیوی دلچسپی سے اکرم کی طرف دیکھنے لگے۔ علی بھی متوجہ ہوا۔

''یہ نام'' اکرم بولا ''خالصتاً'' میری پسند پر رکھا گیا۔ ورنہ اُس کی ماں تو اُس کا نام میرے نام سے ملا کر ''اسلم'' رکھنا چاہتی تھی۔ نام سے بظاہر تو کوئی اختلاف نہیں تھا مجھے بھی مگر بس شوق تھا کہ میرے بیٹے کا نام اللہ کے نام کی نسبت سے رکھا جائے۔ ''عبدالجبار'' مگر پکارنے میں تھوڑا بڑا محسوس ہوتا ہے' تو اُس کی بہن رقیّہ نے اُس کا عُرف ''جبرو'' رکھا تھا لیکن سچ بات ہے کہ عُرف وغیرہ رکھنے میں مجھے کوئی پسندیدگی نہیں تھی۔ ایسے ہی اچھے بھلے نام کو توڑ مروڑ کر کوئی اور نام رکھ دو۔ میں اُسے اُس کے نام سے ہی بلاتا تھا۔ ''عبدالجبار''

یہ کہہ کر اکرم تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گیا۔

''ہاں'' نعمان بولا ''بات تو صحیح ہے مگر...''

عینی نے نعمان کا ہاتھ پکڑ کر اُسے روک دیا۔ پھر اکرم کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر دونوں نے اپنے ہاتھ فوراً الگ کر لیے۔

''ارے کیا ہوا بھئی' اب جیسے بھی ہوئی' شادی تو ہو گئی نہ۔ یہ گھبرانا کیسا؟''

دونوں نے نظریں جھکا لیں۔

''ہاں تو کہاں تھا میں؟''

''عبدالجبار پیدا ہوا...'' علی بولا۔

''ہاں سب بہت خوش تھے۔ہمیں بیٹا اور رقیّہ کو چھوٹا بھائی مل گیا تھا۔بچپن سے ہی ضد کا بہت پکّا تھا۔ جب اَڑ جاتا تھا کسی بات پر تو اَڑ ہی جاتا تھا۔ مجال ہے جو اپنی بات سے ہٹ جائے۔ایک نمبر کا ڈھیٹ۔ماں کی پھر بھی سُن لیتا تھا لیکن میرے سے تو جناب کی بنتی ہی نہیں تھی۔شاید اس لئے کہ زیادہ وقت اُس کے ساتھ گزارنے کو مِلا ہی نہیں مجھے۔مگر رقیّہ اور عبدالجبار کی بہت دوستی تھی۔کھیلنا کودنا' مَستی' شرارت' ہر جگہ آگے تھا رقیّہ سے۔ پڑھنے لکھنے میں بھی اچھا تھا۔لیکن اپنی من مانی کرتا تھا بس۔'' ایسا اگر ہو کوئی انسان تو اُس پر اُس کی صحبت کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔چودہ سال کا تھا تو پہلی بار سگریٹ پیتے دیکھا تھا اُس کو رقیہ نے۔کان سے پکڑ کر لے آئی تھی اُس کو گھر۔ مجھے رقیّہ کی ماں نے آواز دی۔۔۔۔۔اور اس کی حرکت کا پتہ چلتے ہی ایک رکھ کر لگا دی اُس کے منہ پر۔کوئی باپ اپنے بچے پر خوشی سے ہاتھ نہیں اُٹھاتا' مگر میں اور کیا کرتا۔ڈر گیا تھا مَیں کہ اِس کم عمری میں یہ حال ہے تو آگے کیا بنے گا۔ پھر اُس پر کچھ عرصہ مَیں نے نظر بھی رکھی تو مجھے لگا کر سُدھر ہی گیا ہے۔دو چار سال تو کم از کم بڑے معلوم ہوتے تھے۔کچھ سمجھ میں نہیں آئی بات مجھے مگر میں نے اپنی تربیت پر شک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

میں اُس کی طرف سے مطمئن ہونے لگا تھا۔خوش تھا کہ ایک ہی تھپڑ اِسے پٹری پر لے آیا' مگر ایک دن جب وہ سکول سے لوٹا تو میں بھی اتفاق سے گھر پر ہی تھا۔مجھ سے سلام لینے آیا تو مجھے محسوس ہوا جیسے اُس سے تمباکو کی بُو آ رہی ہے۔ میں نے پاس بلا کر اُس سے بہت آرام سے پوچھا کہ سگریٹ پی کر آیا ہے تُو؟ کہتا ہے نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر یہ بُو کیسی ہے؟ وہ خاموش رہا۔دوبارہ پوچھا تو بھی کہتا ہے کہ ایسا تو کچھ نہیں ہوا۔مگر اُس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر مجھے تسلی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں پیار سے پوچھ رہا ہوں۔اگر پی ہے تو بتا دو۔کچھ دیر چپ رہ کر بولا جی پی ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہتا ہے دوستوں کے ساتھ تھا۔اور اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ایک طمانچہ میں نے اُس کے منہ پر دے مارا۔

''جھوٹ بولتے ہو؟ ایک تو سگریٹ پیتے ہو اوپر سے باپ سے جھوٹ بھی بولتے ہو؟'' اور ایک اُلٹے ہاتھ کی لگائی۔

''جس لعنت سے تیرا باپ زندگی بھر خود کو بچاتا رہا آج تُو اُسی لعنت میں پڑ گیا ہے اور اوپر سے جھوٹ۔''

اتنے میں رقیّہ اور اُس کی ماں دوڑتے ہوئے صحن میں پہنچے۔

''کیا ہوا؟'' رقیّہ کی ماں بولی۔رقیّہ نے جا کر عبدالجبار کو گلے سے لگا لیا۔

''پوچھو اپنے لاڈلے سے کیا کر کے آیا ہے یہ۔''

''ہاں ہاں پی ہے سگریٹ۔تو کیا ہو گیا ہے؟''

''تمیز سے بات کرو جبرو۔'' رقیّہ نے اپنے بھائی کو جھڑکتے ہوئے کہا

''کس بات کی تمیز؟'' ہر چیز پر پابندی' ہر چیز پر پابندی۔ایسا بھی کیا کر دیا ہے میں نے؟ بس جب دیکھو میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں سب۔''

یہ کہہ کر عبدالجبار دوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''سمجھا لو اِس کو ابھی ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گی تم۔'' اور میں طیش میں گھر سے باہر آ گیا۔

''بے غیرتی کی بھی حد ہوتی ہے۔'' میں خود سے بات کرنے لگا۔''آج سے پہلے سوچتا تھا کہ کیسے لوگ اپنی تربیت پر شک کرنے لگتے ہیں جب اُن کا بچہ غلطی کرتا ہے۔آج خود کو کوس رہا ہوں۔خدا جانے کیا مصیبت پلّے پڑ گئی ہے۔ایک ہی تو بیٹا ہے میرا۔میرا سب کچھ اُسی سے تو ہے کچھ ہی تو سال ہیں اور پھر ہم اُس کے رحم و کرم کے محتاج ہوں گے۔کیا کرے گا یہ ہمارے لیئے' خود کے لئے؟ کب سمجھے گا کہ باپ کی سوچ اور فکر کیا

ہوتی ہے۔ارے کچھ تو ذمہ داری کا مظاہرہ کرے۔اتنا بھی بچہ نہیں کہ صحیح غلط سے ناواقف ہو۔سگریٹ پیتا ہے' جھوٹ بولتا ہے۔ویسے شاید میں بھی ضرورت سے زیادہ غصّہ کر گیا۔بچہ ہے' غلطی تو کرے گا نا۔مجھے سمجھانا چاہیے تھا۔کیا سوچے گا اپنے باپ کے بارے میں جھوٹ نہ بولے تو کیا کرے۔بندا تھوڑی سمجھداری سے سنبھالتا ہے نہ مسئلے کو۔مجھے جا کر اُس کو منانا چاہیے۔اُس سے نظریں کیسے ملاؤں گا میں۔وہ بھی نہیں مِلا پائے گا شرمندہ تو ہوا ہوگا۔احساس تو ہوا ہوگا نہ غلطی کا۔چلو آج سو جاتا ہوں۔کل اُس کے لیے چھلّی لے کے آؤں گا۔خوش ہو جائے گا۔پھر سمجھاؤں گا۔''

ایک لمبی سانس لے کر میں گھر کی طرف لوٹا۔داخل ہوا تو کوئی آس پاس نہیں تھا۔رقیّہ کی ماں باہر آئی۔

''جی وہ میں بستر لگا رہی ہوں۔سوئیں گے آپ؟ یا کچھ کھائیں گے تو نہیں؟ اوسچ آپ تو بُھو کے ہوں گے' کیسی بھلکڑ ہوں میں ابھی بس...''

''رہنے دو'' میں بولا ''بس سونا چاہتا ہوں میں''

جب کمرے میں آیا تو عبدالجبار اپنا سَر رقیّہ کی گود میں رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔میری طرف دیکھا تو منہ پھیر لیا۔میں کچھ دیر کھڑا انکھیوں سے اُس کے چہرے پر ندامت ڈھونڈتا رہا۔مگر وہ تو اپنی انا میں مست نظر آ رہا تھا۔رقیّہ کا ہاتھ اپنے سر سے جھٹکا۔

''بس اب سونے دو مجھے'' رقیّہ سے بولا۔

رقیّہ بڑبڑا کر اُٹھی اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔میں بھی لیٹ گیا۔سوچ میں تھا مگر نیند جلد ہی آ گئی۔

اُس دن خواب میں ہی اُس کا چہرہ نصیب ہوا مجھے۔مجھ سے کہہ رہا تھا کہ کہیں چُھپنے جا رہا ہے۔دس کی گنتی بھی ڈھونڈھنے نکلوں اُس کو۔آج تک بس وہی گنتی چل رہی ہے۔نو سے دس پر نہیں جایا جاتا۔لیکن میں اتنی جلدی ہار نہیں ماننا چاہتا بس۔وہ رات کو اُٹھا' صندوق سے رقیّہ کے لیے جہیز کے رکھے ہوئے زیور لیئے اور غائب ہو گیا۔اب میں رقیّہ سے آنکھیں چار کرنے کی حالت میں نہ تھا۔کیا جواب دیتا اُس کی نظروں سے چھلکنے والے ہر سوال کا؟ میں بھی بے بس تھا اُسی کی طرح۔وہ کم بخت مجھ سے بدلا لینے میں اپنی بہن کی زندگی خراب کر گیا۔اتنی کمائی نہیں تھی میری کہ یہ سب نقصان بھر سکوں۔اور جو نقصان وہ خود غائب ہو کر مجھے دے گیا تھا وہ تو پورا کرنے کا کوئی امکان سرے سے تھا ہی نہیں۔

ایک گہرا سانس لیا اور ٹیک لگا کر اکرم نے آنکھیں بند کر لیں۔

''رقیّہ کیسی ہے اب؟'' عینی نے دبے لہجے میں پوچھا۔

''رقیّہ'' اکرم مسکرانے لگا ''وہ تو ماشااللہ بہت پیاری گڑیا ہے میری' اُسی کے سلسلے میں جا رہا ہوں لاہور۔اُس کے سسرال والے رہتے ہیں ادھر۔بس کچھ چیزوں پر بات کرنی ہے پھر انشاءاللہ مہینے دو میں شادی ہے اُس کی۔''

''چلو یہ سُن کر تو خوشی ہوئی۔'' نعمان بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

علی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔وہ اپنی آنکھوں کے آنسو چُھپا رہا تھا۔

اکرم کو احساس ہوا تو مسکرا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ارے پگلے' تم کیوں رونے لگے'' اکرم نے پیار سے پوچھا ''اب تو مجھے بھی رونا نہیں آتا۔سُوکھ گئی ہیں میری آنکھیں اب۔''

''تمہاری کوئی بہن ہے علی؟'' عینی نے بے تکلّف ہو کر پوچھا۔

یہ بے تکلفی علی کو پہلے کچھ خاص نہ بھائی۔پھر خود ہی مسکرانے لگا۔

''ہاں ہے نا۔اُس کی بھی شادی کا سلسلہ چل رہا ہے بس۔دیکھیں کیا ہوتا ہے'' یہ کہہ کر علی نے مڑ کر اکرم کو دیکھا اور اپنے آنسو پونچھ لیے۔

''ہاں ہاں۔اللہ سب کے نصیب اچھے کرے'' اکرم مسکراتے ہوئے

بولا۔ ''آج اگر عبدالجبار بھی ہوتا تو کتنی آسانی ہو جاتی مجھے۔ بہت سے کام تو میری لاعلمی میں ہی ہو جاتے۔ رقیّہ کی آنکھوں میں آج بھی اپنے جبرو کے لیے وہی پیار' وہی محبت برقرار رہے نہ جانے سمجھتی کیوں نہیں پگلی۔ اُسی کا تو مقدّر لے کر دوڑ گیا وہ... ارے چھوڑو اب اپنی ہی اولاد کو کیا گالی دوں میں۔''

''تو رقیّہ نے تو اصرار کیا ہوگا اُس کو ڈھونڈنے کا۔'' نعمان نے پوچھا۔

''اصرار؟ ارے وہ تو دوڑی جاتی تھی اِدھر اُدھر۔ منّتیں کرتی تھی میری۔ کہتی تھی وہ نہ ملا تو مَیں بھی شادی نہیں کروں گی۔'' اُس کے سکول کے کچھ لڑکے جاتے تھے ہمارے محلے سے' اُن سے کہہ کر اُن لڑکوں کا پتہ کروایا جن سے دوستی یاری تھی اُس کی۔ اُن میں سے ایک کے گھر بھی گیا۔ بہت منّت سماجت پر وہ اس بات پر راضی ہوا کہ میں عبدالجبار کے نام خط لکھ کر بھیج دیا کروں اُس کے پتے پر اور وہ پہنچا آیا کرے گا۔ بیسیوں خط گئے اور ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔ ہر خط کے بعد ہفتوں انتظار کرتے رہتے مگر نہ' اُس کا گھمنڈ' اُس کی انا۔ خدا جانے کس کیئے کی بھگتی ہے میں نے اُس نکمے کی صورت میں۔''

اِس کے بعد چاروں میں خاموشی طاری ہوگئی۔ علی نے اُس کے اور اکرم کے بیچ میں پڑے ہوئے اپنے بستے کو اُٹھا کر اپنی گود میں رکھا' اس میں سے ایک کاغذ ڈھونڈ کر نکالا اور کچھ لکھنے لگ گیا۔ اکرم آنکھیں بند کر کے اپنی سیٹ کے پچھلے حصے سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ نعمان اس سناٹے سے تھوڑا گھبرانے لگا۔ جیسے ہی وہ کچھ کہنے رکتا' میں اس کو اشارے سے منع کر دیتی کہ اکرم کو اب آرام کرنے دیں۔

''لو جی آ گیا لاہور'' دُور سے اسٹیشن دیکھ کر نعمان خوشی سے بولا۔ عینی بھی کچھ مطمئن سی تھی' مگر جیسے ہی یہ آواز علی کے کان پر پڑی' اُس نے اپنے کاغذ پر آخری کچھ الفاظ لکھے اور کاغذ سکول بیگ میں ڈالا اور اکرم کا سامان اُٹھانے لگا۔ ''چلیے جی آ گیا لاہور۔''

''ارے بیٹا گاڑی رکنے تو دو۔'' اکرم گھبرا کر بولا۔

''رُک جائے گی گاڑی بھی بس آپ تو اُٹھیں۔''

علی کی اس قدر بے چینی سے اُن تینوں میں سے کسی کو بھی اتفاق نہ تھا۔

نعمان بولا ''ارے یار ایسی بھی کیا جلدی؟ ابھی تو . . . ''

''آپ کو رُکنا ہے تو رُک جائیں۔'' نعمان سے کہہ کر علی اکرم کی طرف مڑا۔ ''جلدی کریں بس بہت رش ہو جائے گا۔ پھر کیسے جائیں گے۔''

اکرم کا ہاتھ پکڑ کر علی اُس کو زبردستی دروازے تک لے گیا۔ گاڑی کے مکمل طور پر رُکنے سے پہلے ہی اُس نے اکرم کو اسٹیشن پر اُتار دیا اور سامان دے کر واپس اپنی بوگی میں چلا گیا۔ اکرم نے ایک قُلی سے اپنا سامان اٹھوایا اور پلیٹ فارم سے چل پڑا۔ جیسے ہی اکرم نے خروج کا راستہ پار کیا' گاڑی ایک دھماکے کے ساتھ اُڑ گئی۔ اکرم جیسے ہی پیچھے پلٹا' اُس نے دیکھا کہ یہ دھماکا اُسی کی بوگی میں ہوا ہے۔ لوگوں کا جمگھٹا پورے زور سے اسٹیشن کے باہر رُخ کرنے لگا۔ اکرم جو کہ اس منظر کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا تھا' بھیڑ کی زد میں آ کر چلتا رہا اور اسٹیشن سے باہر آ پہنچا۔

اِرد گرد افراتفری دیکھ کر اکرم چکرانے لگا اور پاس ہی سڑک کے کنارے سہارا لے کر بیٹھ گیا ساری دُنیا جان بچانے کو بھاگ رہی تھی۔

اتنے میں اکرم کی نظر جیسے ہی اپنے سامان پر پڑی' اُس نے دیکھا کہ علی کا بیگ بھی وہ اپنے ہی سامان کے ساتھ لے آیا ہے۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جلدی سے ایک رکشہ دیکھ کر اُس میں بیٹھ گیا۔

''صاحب جانا کدھر ہے؟'' رکشے والے نے رکشہ سٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''تُم چلو میں بتاتا ہوں۔'' اکرم نے یہ کہہ کر علی کا بیگ کھولا۔ اُس کو یقین تھا کہ علی کی منزل کا کوئی نہ کوئی اشارہ اِس بیگ میں اس کو ضرور مل جائے گا۔ وہ بیگ کھول کر ٹٹولنے لگا۔

بیگ میں بہت سے خطوط تھے۔ علی کوئی ڈاک جمع کرتا رہا تھا۔ اکرم نے خطوط باہر نکالے اور خط پڑھنا شروع کیا۔

''عبدالجبار بیٹا کہاں ہو؟...''

ابھی اتنا ہی پڑھا تھا کہ اکرم کی سانس تھم گئی' دھڑکن غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی اور آنسوؤں کی شکل میں ایک طوفان آنکھ سے بہہ نکلا' گال سے رینگتا ہوا تھوڑی تک پہنچا اور ٹپک گیا۔ یہ لکھائی خود اکرم کی ہی تھی۔

اکرم ڈر گیا تھا۔ اُسے اچانک ایسا لگا جیسے اُس سے اُس کا سب کچھ چھن گیا ہو۔ دھماکا ہونے سے قبل دِکھنے والا آخری چہرہ اُس کے اپنے بیٹے کا ہی تھا' جو نہ جانے خود بچا بھی ہوگا کہ نہیں۔ وہ ایک دم سارے خط باری باری پڑھنے لگا۔ ساری کی ساری ڈاک خود اکرم کے ہی گھر سے تھی۔ بیچ میں ایک کاغذ اور تھا۔ یہ لکھائی کچھ مختلف تھی۔ یہ وہ کاغذ تھا جس پر علی' یعنی عبدالجبار' ٹرین میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اکرم نے اُس کاغذ کو پڑھنا شروع کیا۔

''ابّا مجھے یقین ہے کہ جب آپ یہ خط پڑھ رہے ہوں گے' میں آپ کے پاس نہیں ہوں گا۔ جی ابّا۔ میں عبدالجبار ہی ہوں۔ آپ کا عبدالجبار۔ آپ کو ٹرین میں دیکھ کر میں بہت گھبرا گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے آپ سے جُھوٹ کہنا پڑا۔ معلوم ہے آپ کو جُھوٹ پسند نہیں' مگر اب آپ کے تھپڑ کا کوئی ڈر نہیں مجھے۔ اُمید ہے اماں اچھی ہوں گی اور رقیّہ آپی بھی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپی کی شادی میں شریک نہیں ہوسکوں گا۔ خیر' آپ یہ ہر گز نہ سمجھئے گا کہ یہ کاغذ کا ٹکڑا میری شرمندگی اور میری کوتاہی کا اعتراف ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ آپ کے ساتھ رہ سکنے کی برداشت مجھ میں نہ اُس وقت تھی اور نہ اب ہے۔ میں مشکور ہوں خدا تعالیٰ کا کہ میں نکل آیا۔ یہی وسیلہ تھا میری کامیابی کا اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ میں آپ کا بھی مشکور ہوں کہ آپ نے میرا نام عبدالجبار رکھا۔ یہ نام اللہ تعالیٰ کے نام کی نسبت ہے' اور اسی لیے میری فلاح میں اس کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ آج میں دینِ اسلام میں معرفت کے اُس مقام پر ہوں کہ اور کوئی شاید ہی پہنچ سکے۔ میرے پیر صاحب نے جو کچھ مجھے سکھایا' میں نے بخوبی اُس پر عمل کیا۔ تبھی تو یہ ذمہ داری کا کام میرے ذمّہ لگایا گیا ہے۔ لبّا یہ لوگ جو ہمارے اِردگرد خود کو مسلمان کہتے ہیں' سب منافق ہیں' ڈھونگ کرتے ہیں۔ اسلام کے نام کے سائے تلے پناہ لیتے ہیں یہ بزدل ہیں آج ان کے سبق کا دن ہے۔

آج اِن کے انتقام کا دن ہے۔ وہ کانچ کے برتن نہیں ہیں میرے سامان میں وہ ایک بم ہے' جس سے اِن سب کو اِن کا انجام ملے گا۔ آپ ہی کہتے تھے کہ دین کے سامنے جان کے کوئی معنی نہیں۔ میرے پیر صاحب نے بھی یہی سکھایا ہے۔ اُمید ہے اب تو آپ کو مجھ پہ فخر ہوگا۔ میری جان جاتی ہے تو جائے لیکن اپنے ساتھ اِن ڈھونگیوں کی جان...''

اکرم رُک گیا۔ اُس کو ایسا لگا جیسے اُس کے پیروں تلے زمین نکل گئی ہو۔ اُس کو اپنی تربیت اور اپنے وجود سے گھن آنے لگی۔ غصّے سے اپنے آنسو پونچھے اور کاغذ کو مٹھی میں دبا لیا۔

''اِس سے بہتر تھا کہ مرنے دیتا مجھے اپنے ساتھ ہی۔ کم بخت' بدنصیب... تُو میرا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ تو عبدالجبار نہیں ہوسکتا۔''

یہ کہتے ہی اکرم نے کاغذ رکشے سے باہر پھینک دیا اور زور زور سے سانس لینے لگا جیسے ہی تھوڑا سکون آیا' رکشے والے سے بولا۔''

''یہ رکشہ واپس موڑ بھائی۔ ہم غلط راستے پر آ گئے ہیں۔ واپس چلو بھائی۔ واپس چلو۔''

منظومات

تابندہ اشرف

ربُّ العلیٰ

ماورائے تخیل رسا تیری ذات ہے رب العلیٰ
تو دلوں کے کتنا قریب ہے، میں پھر بھی تجھ سے نا آشنا

میرے سینۂ جاں میں جو اک آئینہ محفوظ ہے
تیرا عکس اس پہ جلوہ نما، میں پھر بھی تجھ سے نا آشنا

خس راہِ گل بنتے رہے بچھڑے لوگ بھی ملتے رہے
تو کریمِ سرمد میں شکوہ کناں، میں پھر بھی تجھ سے نا آشنا

یہ تڑپ کہ تجھ سے ملوں کہیں، حالِ دل تجھ سے کہوں کبھی
تو رگِ جاں میں سمایا ہوا، میں پھر بھی تجھ سے نا آشنا

تیری دید کی تاب نہیں، تیرا خیال تک یاد نہیں
تیرا رنگ مجھ میں رچا ہوا، میں پھر بھی تجھ سے نا آشنا

کیا خبر کہ تجھ کو بھلی لگے، میری کوشش نا تمام یہ
تو مٹا ہی دے میرے گناہ، میں پھر بھی تجھ سے نا آشنا

محمد عثمان اختر

شہرِ اسلام آباد

جو دور سے آتا نظر دشت و بیاباں
وہ نزد سے دیکھو تو ہے خوابوں کا گلستاں
اک سمت ہے پھیلی ہوئی کہسار کی تصویر
اِک اور ہے بکھری ہوئی سڑکوں کی کہکشاں
چشمے کہیں چلتے ہیں پہاڑوں کی جبیں پر
باغات کہیں سبز، کشادہ و فراواں
قدرت نے کہیں خوب تراشا ہے شہر کو
انسان نے کہیں بخشا اسے حسنِ بیشتاں
دامن میں کسی کوہ کے تفریح کے خزانے
روشن کوئی وادی بنی وادیٔ چراغاں
ہے علم سے معمور معطّر فضا اس کی
ہر کوچہ ہے تعلیم کی آواز سے شاداں

محمد عمیر

ماں

رحماں! ترے کرم کی تجلی ہے میری ماں
میرے لئے ہے باعثِ تخلیق میری ماں

تُو نے مجھے جنم دیا تو نے جواں کیا
ہے کس قدر رحیم کا احسان میری ماں

احسان اُتار سکتا نہیں ایک رات کا
کوشش کروں تو ہو گا نہ پھر بھی یہ حق ادا

جنت ہے دم قدم سے ترے اِس جہان میں
جنت ہے تیرے پاؤں تلے اُس جہان میں

مجھ کو پڑھا لکھا کے جو علم و ہُنر دیا
اِحساں ترا عظیم ہے یہ بھی تو میری ماں

یہ مامتا کی گود تھی تیری ہی میری ماں
جس نے نِکھارِ آدمیت مجھ کو دے دیا

تراشا خوب، یوں مجھے اِنسان بنا دیا
رنگِ حِنا دیا، گُلِ خنداں بنا دیا

رحم و کرم خدا کا مِلا تیری شکل میں
ہیں رنگِ کائنات سبھی تُجھ سے میری ماں

اسد طارق

سوچتا ہوں میں

کبھی یہ سوچتا ہوں میں، کبھی وہ سوچتا ہوں میں

کبھی یہ سوچتا ہوں میں کہ جب یہ رات ہوتی ہے
تو اِن کانٹوں کے بستر پہ کوئی اِک آس سوتی ہے

دل کے کسی کونے میں اِک ذات کہیں چُھپ کر
بغیر آواز ہنستی ہے، بے آواز روتی ہے

تڑپتی ہے، بکھرتی ہے، بگڑتی ہے، سلگتی ہے
ہارِ تنہائی میں چُن کر آنسو پروتی ہے

تاریکیوں سے چھلکتی مایوسی بے پناہ
دھیرے دھیرے سے اُس وجود میں سموتی ہے

کبھی یہ سوچتا ہوں میں، بڑھتا ہے وقت جیسے جیسے
بڑھتا ہے دل میں خوفِ فنا ویسے ویسے

جلا ڈالوں گا خود کو خود ہی کی آگ میں
آتے ہیں ذہن میں خیالات ایسے ایسے

غوروفکر میں مشغول رہتا ہے دل میرا
آئے ہیں راستے یہ دشوار کیسے کیسے

بنا کر ذہنِ تنہا کو آشیاں اپنا
بھرتا ہے اِس میں وسوسے شیطان ایسے ویسے

کبھی یہ سوچتا ہوں میں کہ میں سوچتا ہوں کیوں
بیتی ہوئی صبح کی گزرتی رات میں یوں

جو تھا کبھی فراز پر، ہے اب نشیب کی نذر
یہ سوچ کر میں بھلا کیوں جلاتا ہوں خوں

اگر وہ دن حقیقت تھا، تو یہ رات بھی حق ہے
کیوں اس سچ سے نظریں بچاتا پھروں

کیوں ناگزری صبح پرمشکور ہوں رب کا
کیوں نہ گزرتی رات میں صبر میں کروں

کبھی یہ سوچتا ہوں میں کہ اب جو یہ رات ہے
کچھ دیر میں اِک صبح نو کی شروعات ہے

پھر روشنی ہو گی دل کی گلیوں میں جھومتی
یہ تاریکی یاس بس لمحے دو کی بات ہے

آزمایا گیا اُس پل کہ جب رات ہوئی تھی
یہ چڑھتا سورج میرے صبر کی سوغات ہے

رات انجام کو اپنے ہے، صبح آنے کو ہے
یہ ہمت کی جیت ہے، یہ ظلمت کو مات ہے

کبھی یہ سوچتا ہوں میں، کبھی وہ سوچتا ہوں میں

فیصل اصغر

''میرے مولا''

میں تیری عَدن کا راہی ہوں
میری گمراہی سے پناہ مولا!
مُجھے چاہے دولِ جہاں دے دے
مُجھے تیری ہی ہے چاہ مولا!

اس بھوکی بگڑی دنیا میں
کیا کھویا پایا آدم نے
جب خالق مالک تُو ہے رب
تو کیسی حرص و ہوا مولا!

تُو دیکھ یہ بنتِ حوّا نے
کیا ناز حیا کے بوئے ہیں
جب خوفِ خُدا ہی مٹ جائے
تو کیسی مَن میں حیا مولا!

تُو دیکھ یہ طفلِ حاضر کو
کیا سوز و ساز کی ہل چل ہے
کیا کُفر کے رنگ ہیں رگ رگ میں
تو کیسا نورِ ہُدیٰ مولا!

مُجھے دیکھ میں بَھٹکا راہی ہوں
میرے ڈھیروں رنگ بدلتے ہیں
کبھی دنیا میں میں ڈھلتا ہوں
کبھی تیرے رنگ میں رنگتے ہیں!

مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے رب
تیرے عِشق کو میرے گھر کر دے
مجھے دنیا کا مطلوب نہ کر
مجھے اپنا عَبد بنا مولا!!!

سعد علی

''تم''

نہ وہ لفظ کسی زباں میں
نہ وہم کسی گماں میں
تم ہو کیا میں بتا سکوں
وہ زباں کہاں، وہ بیاں کہاں!

تو نہیں حسیں، تو نہیں حسیں
تو ہے ماہ جبیں، ہاں ماہ جبیں
جو بھی دیکھے تجھے، وہ پکار اٹھے
آفریں، آفریں!

تیری ہنسی، ہاں یہ ہنسی
ہائے! کیوں بنی میری بے بسی
مسکراؤں جو تنہائی میں
لگتی ہے کوئی سزا سی

تم ہو کیا؟
حور ہو کہ اَپسرا
خواب ہو کہ نشہ
ابتدا ہو کہ انتہا
مجھے کیا پتا! مجھے کیا پتا!

وجیحہ حسن

''عورت''

میں آج کے دور کی وہ ہستی
جو ظلم کے پاٹوں میں پس کر
ہر لحظہ راکھ بنی
جو دُکھوں کی چادر میں لپٹی
گھر گھر کی ساکھ بنی
کبھی پنچایت میں کاری بن کر
جبر کی دار چڑھی
کبھی چولہا پھٹنے کی آوازیں
جُھلسے بدن سے اُٹھتی چیخیں
کبھی باپ کی آن پہ قربان
کبھی بھائی کی غیرت کی خاطر
کبھی طعنے تشنے سن کر
میں جلتی ریت پہ ننگے پاؤں
کب سے تنہا دوڑ رہی ہوں
کب سے تنہا دوڑ رہی ہوں

آسمہ ہاشم

میرا شہر

جس شہر میں زندہ لاشیں ہوں
جہاں ہر سو خون کی لالی ہو

جس شہر کے ہر چوراہے پر
جس والیٔ شہر کے زنداں میں

میں ایسے شہر کی باسی ہوں
ہاں! ایسے شہر کی باسی ہوں

جس شہر پہ موت کا سایہ ہو
جہاں خوف دلوں پہ چھایا ہو

بے گور و کفن کچھ لاشیں ہوں
ارمانوں کی بکھری قاشیں ہوں

جہاں خون دیے میں جلتا ہے
جہاں ظلم کا سکہ چلتا ہے

محسن ممتاز مرزا

''کبھی تو آغازِ باب ہوگا''

گمشدہ تھا جو گیسوئے زن میں' وہ نوجواں بازیاب ہوگا
نہ محفلِ جام بادہ ہو گی' نہ زمزمۂ رباب ہو گا
ہاں پھر سے جاگے گا یہ مسلماں! ہاں پھر سے خوفِ وہاب ہوگا
''رہے گی سادہ کتاب کب تک' کبھی تو آغازِ باب ہوگا''

جو جھاگ بن کر رکے ہوئے تھے' وہ تند سیلاب پھر اٹھیں گے
جو طوفان بے ساز و بے رواں ہیں' وہ مثلِ سیماب پھر اٹھیں گے
اے ماں! نہ گھبرا کہ پورا تیرا حسین پھر یہ خواب ہو گا
''رہے گی سادہ کتاب کب تک' کبھی تو آغازِ باب ہوگا''

غریب کی نعش پر بھی ظالم' یہ گھر بناتے ہیں' کیسے حاکم؟
یہ بیچ کر زیوراتِ دل کو' محل سجائے ہیں' کیسے حاکم؟
ہاں پھر سے اٹھے گا شورِ محشر' ہاں پھر سے روزِ حساب ہو گا
''رہے گی سادہ کتاب کب تک' کبھی تو آغازِ باب ہوگا''

عثمان رسول

محبت

بہت بے نام سا رشتہ
بہت بدنام سا رشتہ
محبت جس کو کہتے ہیں
میں چاہوں تم سے گر رکھنا
تو کیا انکار کر دو گے؟
میں تم سے یہ نہیں کہتا!
کہ تم بھی اپنی ساری یادیں میرے نام کر دینا
میری خاطر تم اپنی نیندیں بھی قربان کر دینا
میری طرح تم اپنے آپ کو بدنام کر دینا
ہر اک آہٹ پہ تم بھی چوکھٹ کی طرف تکنا
مگر نہ پا کے مجھ کو پھر جبیں تکیے تلے رکھنا
خدا سے ہر دعا میں تم فقط میری خوشی چاہنا
جو کہنا مجھ کو ہی کہنا جو لکھنا مجھ کو ہی لکھنا
کہ تم مجھ کو اجازت دو
کہ تم کو اپنی دھڑکن میں کروں میں اس طرح شامل
کہ جیسے راگنی میں کوئی دلکش راگ ہو شامل
تمہاری مسکراہٹ توشۂ جیون بنا ڈالوں
تمہارے نام کو ہر سوچ کی خوشبو بنا ڈالوں
تمہیں وصل و ہجر ہر جا ہمیشہ رو برو دیکھوں
کروں گر مختصر میں تم کو اپنی روح میں دیکھوں
تو کیا انکار کر دو گے؟
میں چاہوں تم سے رکھنا
اک یہی بے نام سا رشتہ
یہی بدنام سا رشتہ
محبت جس کو کہتے ہیں
تو کیا انکار کر دو گے؟

اسد طارق

عکس

جب دن کا اجالا ڈھلتا ہے
اور رات جواں ہو جاتی ہے
اک عکس سے آئینے میں
میں اکثر باتیں کرتا ہوں

وہ عکس بڑا دیوانہ ہے
ہر بات پہ مجھ سے لڑتا ہے
اس بات سے پر میں واقف ہوں
وہ پیار مجھ ہی سے کرتا ہے

وہ عکس بہت حساس بھی ہے
معمولی بات پہ لڑتا ہے
روٹھے تو میں مناتا ہوں
تاخیر سے راضی ہوتا ہے

وہ عکس بڑا شفاف بھی ہے
جیسی ہو بات بتاتا ہے
کچھ مگر وہ دھندلا سا ہے
کوئی بات چھپائے بیٹھا ہے

وہ عکس کہ نظر ملاؤں جب
مجھ سے نظر چراتا ہے
رہتا ہوں ڈھونڈتا اُس میں کچھ
وہ مجھ میں ڈھونڈتا جاتا ہے

وہ عکس ، کہ خود کو سنواروں جب
کچھ کِھل کِھل سا جاتا ہے
کھلنے کا سبب جو پوچھوں میں
وہ دھیرے سے مسکاتا ہے

وہ عکس، کہ خوش میں ہوتا ہوں
تو خوش نظر وہ آتا ہے
ہنس کے دیکھتا ہوں اُس کو
وہ اور مجھے ہنساتا ہے

وہ عکس کہ جب دکھی ہوں میں — غم میرے میں مل جاتا ہے
میں یہاں درد سے روتا ہوں — وہ وہاں آنسو بہاتا ہے

وہ عکس ہے مگر سچا ہے — کہ جو ہوں وہ دکھلاتا ہے
کچھ راز جو مجھ سے رکھتا ہے — جب پوچھوں تو بتلاتا ہے

وہ عکس ہے مگر انسان ہے — کہ انسانیت اُس میں زیادہ ہے
خوشیوں میں خوش ہوتا ہے — دکھ میں دکھی بھی رہتا ہے

وہ عکس ہے مگر بھولا ہے — کہ مجھ کو سمجھ نہیں پاتا ہے
وہ عکس ہے مگر سادہ ہے — کہ ساتھ پھر بھی نبھاتا ہے

تنہائی کے اندھیرے میں — میں جب بھی ڈوبا ہوتا ہو
اک عکس سے آئینے میں — میں اکثر باتیں کرتا ہوں

محمد عمیر

اَے شہیدِ وفا اَے شہیدِ وطن

(کیپٹن محمد وقاص شہید کی شہادت کے موقع پر)

تم ہو شیرِ وطن تم ہو خیبر شکن　　اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن
نہ شاعر نہ اوقات ہے یہ مری　　لِکھ دیا ہے تیرا دیکھ کر بانکپن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

ہیں لحد پہ تری نغمہ زن نغمہ زن　　خُوش گلو ہیں جو سارے طَیورِ وطَن
اللہ اللہ یہ کیا شان ہے تیری شاں　　تُجھ پہ لولاک ہے خندہ زن خندہ زن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

تُم نے زیور بنایا ہے شمشیر کو　　مقصدِ زندگی شانِ شبیر کو
تو نے سُلجھایا گیسوئے تقدیر کو　　گلشنِ پاک کو دی ہے تُو نے پھبن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

شانِ گلشن رہے گی تیرے نام سے　　تیری للکار سے تیری یلغار سے
رُوپ لالہ و گل کا نیاء دھار کر　　باغِ ہستی میں ہو گے تُم مثالِ عدن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

یہ جو ہم دیکھتے ہیں گلاب وسمن　　سب تیرا رُوپ ہے اے شہیدِ وطن
ہم سدا اس روایت پہ اترائیں گے　　رِیت تیری بنے گی حدیثِ وطن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

تُم پہ نازاں ہے میری یہ خاکِ وطن　　تُم سے فرحاں معطر شمیمِ وطن
تم مجاہد ہو ہیرو ہو اس دیس کے　　تم سے قائم ہے دائم ہے شانِ وطن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

تیری جُرأت سے آزاد ہو گا سبھی　　قلمرو میں تیری ہو گا کشمیر بھی
اک نئی شاں سے اُبھرے گی یہ سرزمیں　　ہوگی روشن تیرے خوں سے اِس کی جبیں

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

دِل میں مِلّت کے تیری ہیں جولانیاں　　تیری جُرأت شجاعت کی تابانیاں
تیرے کردار سے تیرے گُفتار سے　　تیرے دم سے فروزاں ہے شمعِ وطن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

دبدبہ سے تیری اے شہیدِ وفا　　لرز اُٹھے عدو کے یہ کوہ و دمن
تم ہو کاتب زمانے کی تقدیر کے　　تم سے قائم ہیں میرے یہ سروسمن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

چاند تارے ہو تم دینِ اسلام کے　　تُم سے قائم ہیں اَسلاف کے طنطنے
تم ہو خیبر شکن تم ہو شیرِ وطن　　پاک مٹی کے تم ہو سپوتِ وطن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

حسن کلیوں میں پھولوں میں ہے جو عیاں　　تیری ہستی کا جو بن ہے اس میں نہاں
کارِ گلشن میں قائم تیری ذات ہے　　ضو سے تیری یہ کھلتے ہیں پھول اور بن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

وقتِ رُخصت جہاں سے جو تکلیف ہے　　ایک چیونٹی کے کاٹے کا درد و الم
کر گئی یہ امر تجھ کو میرے جواں　　موت بھی ہے تیری اِک نیا بانکپن

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

ہے یہ واضح لکھا پیارے قرآن میں　　ہے یہ وعدہ خدا کا تیری شان میں
تُو تو مردہ نہیں زندہ جاوید ہے　　رزق ملتا ہے وافر تجھے دم بدم

اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

خُلد میں حُور و غلماں تیری منتظر　　تیری خاطر سجے ہیں گلِ خندہ زن
خُلد بھی گاؤ تکیے بچھائے ہوئے　　تیری آمد کی خوشیوں میں ہے غوطہ زن
اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

اے خدا تو ہمیں بھی یہ توفیق دے　　ہووطن کے شہیدوں کی جُرأت عطا
ہو جھپٹنے پلٹنے کی طاقت عطا　　رہبری کو ہوں میری تیرے نقشِ پا
اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

روزِ محشر کو پہنیں گے تاج زریں　　چاند تاروں سے ہو گی فزوں تر جبیں
تیرے انوار بکھریں گے چاروں طرف　　کتنی پر نور ہو گی یہ تیری جبیں
اے شہیدِ وفا اے شہیدِ وطن

اویس عزیز

روشن کرنیں

خدا کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

☆

دنیا اس کو یتیم سمجھتی ہے جس کے ماں باپ نہ ہوں مگر میں اس کو یتیم سمجھتا ہوں جس کے اچھے دوست نہ ہوں

(حضرت علیؓ)

☆

جب آنکھیں نفس کی پسندیدہ چیزیں لگیں تو دل انجام سے اندھا ہو جاتا ہے

(حضرت علیؓ)

☆

معاف کر دینے سے انسان کی اپنی روح پاک ہوتی ہے

☆

جب جسم موت کے لیے ہے تو اللہ کی راہ میں شہید ہونا سب سے بہتر ہے

(حضرت امامؒ)

☆

آہستہ بولنا، نیچی نگاہ رکھنا، میانہ چلنا ایمان کی نشانی ہے

(حضرت عثمان غنیؓ)

زبان درست ہو جائے تو دل بھی درست ہو جاتا ہے

(حضرت عثمان غنیؓ)

☆

جو آدمی زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے

(حضرت عمر فاروقؓ)

☆

وضو جوانوں کی طرح کرو، نماز بوڑھوں کی طرح پڑھو اور دعا بچوں کی طرح مانگو

(حضرت علیؓ)

☆

دن کی روشنی میں رزق تلاش کرو، رات کو اسے تلاش کرو جو رزق دیتا ہے

(حضرت شیخ سعدیؒ)

☆

اگر تم عبادت نہیں کر سکتے گناہ کرنا چھوڑ دو

(حضرت شیخ سعدیؒ)

☆

مومن کے لیے اتنا علم بھی کافی ہے کہ اللہ سے ڈرتا رہے

(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

تبصرے

نسٹ کا منفرد اعزاز

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کے ادبی مجلّہ نسٹیئن کا آغاز 2011ء میں ہُوا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے 2011ء اور 2012ء کی اشاعتوں کو اہلِ نظر کی فراخدلانہ پذیرائی نصیب ہوئی۔ صاحبانِ علم و قلم نے نسٹیئن ہی نہیں، افواجِ پاکستان کے تعلیمی اِداروں خصوصاً نسٹ کے معیار، اس کے شعبوں کی ہمہ پہلو ترقی، بلند پروازی اور قومی زندگی میں اس کے کردار کو بھی خوب خوب سراہا۔ ممتاز قومی اخبارات میں عالمی شہرت یافتہ کالم نگار حضرات نے اس پر کالم لکھے جو صحافت میں بالکل انوکھی بات ہے کیونکہ جرائد پر چند سطری تبصرے عموماً تبصرۂ کتب کے کالم میں کئے جاتے ہیں۔ یوں نسٹ کے لیے یہ منفرد اعزاز ہے۔ ربِّ کریم کے اس کرم کا شکر ادا کرنے کے ساتھ بارگاہِ ربِ کریم میں التجا ہے کہ نسٹ اور اس کے اِداروں کے سفرِ شوق و جستجو کو تیز تر اور مفید تر بنا دے۔ آمین!

اہلِ قلم کے دلی شکریے کے ساتھ نسٹیئن 2012ء سے متعلق چند نمائندہ کالموں کے منتخب حصے، تاریخِ اشاعت کی ترتیب کے مطابق، پیشِ خدمت ہیں۔ (اِدارۂ نسٹیئن)

ایک غیر فوجی جریدہ

عبدالقادر حسن

[غیر سیاسی باتیں، ایکسپریس، 12 مارچ 2013ء]

ناگفتہ بہ حالات کے دھندلکے سے سر نکال کر میں آج کے حالات کو پرے جھٹک کر ایک فوجی تعلیمی ادارے کا ذکر کر رہا ہوں یعنی نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی۔ یہ ادارہ اسلام آباد میں موجود ہے اور سائنس کی دنیا میں پاکستانی نظریات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کا مخفف نام ''نسٹ'' بنتا ہے اور یہ اسی نام سے معروف ہے۔ اس کے ادبی جریدے ''نسٹیئن'' کا تازہ شمارہ میرے سامنے ہے۔ فوج ہمارے ہاں یا تو ملک کا دفاع کرنے والا ادارہ ہے یا مارشل لاء لگانے والا، لیکن علمی، سائنسی اور تحقیقی میدان میں ملک کا دفاع کرنے میں اسے پہلی بار اس یونیورسٹی کے ذریعہ دیکھ رہا ہوں۔

نسٹیئن کا یہ شمارہ بے حد خوبصورت اور اردو اور انگریزی کے بیش قیمت مضامین سے آراستہ ہے۔ ان تحریروں سے ایک ایسی نسل تیار کرنے کی نوید ملتی ہے جو سراپا پاکستانی ہو، مکمل میڈ اِن پاکستان۔ اس جریدے میں سینئر لوگوں مثلاً پروفیسر فتح محمد ملک، قدرت اللہ چودھری اور ہم عصر دانشوروں کے مضامین شامل ہیں اور ان کے ساتھ طلبہ کی نگارشات بھی۔ نوجوان تحریروں میں تازگی ہے اور پاکستان ہے۔ اس جریدے کے سرپرست اقبالؒ شناس، علم پرور انجینئر محمد اصغر ہیں اور مجلسِ مشاورت میں انجینئر محمد شاہد اور ڈاکٹر آصف رضا جیسے سائنس دان شامل ہیں۔ یہ سائنسی تعلیمی ادارہ فوج کی علم دوستی اور پاکستانی نظریات کی نرسری کی زندہ علامت ہے۔ اس شمارے کا اداریہ ظاہر ہے کہ اس کے ایڈیٹر ممتاز اقبال ملک نے لکھا ہے۔ افسوس کہ مَیں تنگنائے کالم میں بند ہُوں اور اس کا خلاصہ کرنے پر مجبور ہوں ورنہ یہ نئی نسل کے نام حقیقی مسلمان فوج کا ایک پیغام ہے جو یک گونہ مارشل لاؤں کا کفّارہ بھی ہے، اس لئے اسے لفظ بہ لفظ حرف بحرف نذرِ قارئین ہونا چاہیے۔ اب آپ اس اداریے کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں:

''اللہ تعالیٰ رحم فرمائے پاکستان اور اہلِ پاکستان پر کہ انہیں اعصاب شکن اندرونی مشکلات اور تشویشناک بیرونی معاملات کا سامنا ہے۔ بیرونی

کھلاڑیوں کے کھیل کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ شرارِ بولہبی ازل ہی سے چراغِ مصطفویؐ سے پنجہ آزما ہے۔ سوال ہوسکتا ہے کہ یہ جو اندرونی بروکر ہیں' ان کا مسئلہ اور بیماری کیا ہے؟ جواب سیدھا ہے اور آسان بھی۔ اور وہ یہ کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قیامِ پاکستان کی بدولت ان کی اوقات سے زیادہ دے دیا! یہ بتائیں بھلا یہ یا ان کے آباواجداد کیا تھے قیامِ پاکستان سے پہلے اور اِنہوں نے کیا دیا پاکستان کو؟

ان کا ٹارگٹ نوجوان نسل خصوصاً ہونہار طلبا وطالبات ہیں۔ یہ لوگ ٹی وی چینلز پر نوجوانوں سے کُھلم کُھلا کہتے ہیں کہ ''یہ ملک بھلا آپ جیسے ہونہاروں کے لئے کوئی رہنے کی جگہ ہے!'' مخصوص چینلز کس کا ایجنڈا پیش کررہے ہیں' کون نہیں جانتا؟ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے علاقے کی تین جوہری طاقتوں چین' روس اور بھارت کا ہمسایہ ایٹمی ملک پاکستان کوئی معمولی نہیں' بڑا اہم ملک ہے جو بڑے بڑوں کے عزائم کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ پاکستان اس ایران کا پڑوسی ہے جس کو جلد یا بدیر زیر کرنے کے لئے اربوں کھربوں کے منصوبے رُوبہ عمل ہیں۔ پاکستان اس عوامی جمہوریہ چین کا قابلِ فخر پڑوسی اور بہترین دوست ہے جو آنے والے دنوں میں مغرب کو ہر میدان میں للکارے گا۔ پاکستان اس افغانستان کا پڑوسی ہے' مخلوقِ خدا کو پتھر کے زمانے میں لے جانے کی دھمکی دینے والوں کو' جہاں سے بہت بے آبرو ہوکر' جگ ہنسائی سے آلودہ پسپائی اور شرمناک فرار کے لئے پاکستان ہی کی مدد درکار ہوگی۔ کل کی بات ہے' سابق امریکی سیکرٹری خارجہ جارج شُلز نے CNN کے ایک پروگرام کے دوران کہا:

''. . . وسطی' مغربی اور جنوبی ایشیا کے سنگم پر واقع پاکستان کا وجود آزاد دنیا' حتیٰ کہ جاپان تک کی سلامتی کے لئے اہم ہے۔ خشکی میں گھری وسطی ایشیائی دنیا کے لئے تو یہ آکسیجن کی حیثیت رکھتا ہے. . . .''

اپنی ساری کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود ملتِ پاکستان میں بے حد صلاحیت' بے حساب امکانی قوتِ اتحاد اور غیر معمولی جذبۂ خیر و فلاح موجود ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد پاکستان پہلا ملک ہے جسے فوجی جارحیت کے ذریعے دو ٹکڑے کر دیا گیا لیکن اہلِ پاکستان اِدھر ڈوبے' اُدھر نکلے کی اقبالؒ تعبیر بن کر پھر سے ہر میدان کی صفِ اوّل میں نظر آنے لگے۔ بس ضرورت ہے بے لوث اور بے خوف قیادت کی جو قوم کی خوشحالی اور ترقی کے لئے واضح حکمتِ عملی اور جرأت مندانہ پالیسی اپنا سکے۔

اب اہلِ پاکستان کو فکری انتشار سے دوچار کر کے ذہنی عدم استحکام کا شکار بنانے کا محاذ کھول دیا گیا ہے۔ کہا' لکھا اور کہلوایا جارہا ہے کہ ''قیامِ پاکستان کی بنیاد پرانی ہوچکی' اس لئے (اللہ نہ کرے) اس کے وجود کو خطرہ ہے''۔ عرض یہ ہے کہ عقیدے اور نظریے لباس کی طرح صبح شام یا گرمی سردی میں بدلنے کی شے تو نہیں۔ ایسا ہو تو ہر قوم اپنی شناخت سے محروم ہو جائے۔ تحریکِ پاکستان قائدِ اعظمؒ کے اس فرمان کی روشنی میں برپا ہوئی کہ ''. . . مسلمان بھارت میں بسنے والی کوئی اقلیت نہیں بلکہ ایک ایسی جدا قوم ہے جس کا رب' دین' ایمان اور نظامِ عبادات ہندوستان میں بسنے والی دیگر اقوام سے قطعی جدا ہے۔ ہم پہلے مسلمان ہیں اور پھر کچھ اور. . . .'' نتیجے میں 65 برس پہلے دنیا میں وہ ریاست وجود میں آئی جو انسانی تاریخ میں پہلی بار دینی تشخص اور عقیدے کی بنیاد پر طلوع ہوئی۔

اللہ کی مرضی! اس ملک میں رہ کر' اس ملک کا کھا کر بیرونی مفادات اور افکار کی جگالی کرنے والے بیچو لئے اس ملک کے (خاکم بدہن) ٹوٹنے کی بات یوں کرتے ہیں جیسے کانچ کی چوڑی توڑنے کا ذکر ہو رہا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اُس دور کی ہر سُپر پاور کی سرتوڑ مخالفت اور مسلمانانِ ہند کی بے سروسامانی کے باوجود صرف سات سال کی جدّ وجُہد

کے بعد پاکستان کا معرضِ وجود میں آجانا ایک عجوبہ ہے۔اس عجوبے کے ظہور سے کیا یہ حقیقت واضح نہیں ہوجاتی کہ قیامِ پاکستان اس ذات پاک کا نمونۂ قدرت ہے جو دنیا کی تمام سُپر پاورز سے عظیم تر ہے۔ جو جب چاہے کسی ناتواں' بے سروساماں کو قوت وعظمت بخش دے اور جب چاہے کسی صاحبِ جبروقوت کو خاک پر پٹخ دے۔

جب ذاتِ باری تعالیٰ کو منظور ہُوا کہ اپنے پسندیدہ دین کو سیاسی شوکت بخشنے کے لئے ایک خطۂ زمین کو جغرافیائی وحدت کے طور پر ہویدا کرنا ہے' تو پاکستان کو طلوع کر دیا۔ پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لئے بیرونی دشمنوں کے علاوہ پاکستان کے اندرونی دشمنوں کی چالیں اور منصوبے بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں بار بار تار تار ہوئے اور ان شاءاللہ تعالیٰ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔اسی لئے تو پاکستان اپنے ہر خیر خواہ اور بدخواہ کو پکار پکار کر سُنا رہا ہے' بتا رہا ہے: انشاءاللہ تعالیٰ مَیں نے رحمتِ باری تعالیٰ کے سائے میں بہرحال قائم رہنا ہے!''

ظہورِ ترتیب

الطاف حسن قریشی

[صورتِ حال' روزنامہ جنگ' 5اپریل 2013ء]

وہ ڈھاکہ میں اُس تقریب میں شریک ہوئیں جس میں ''بنگلہ دیش دوستی'' کے نام پر تیرہ پاکستانیوں کو اعلیٰ ترین سول ایوارڈ دیئے گئے۔اُنہوں نے اپنے والد جناب فیض احمد فیض کا ایوارڈ وصول کرتے ہوئے بڑی بے رحمی سے کہا: ''حکومتِ پاکستان کو بنگلہ دیش کے عوام سے اُن مظالم پر باقاعدہ معافی مانگنی چاہیے جو 1971ء کی جنگِ آزادی میں قابض پاکستانی فوج نے بنگالیوں پر ڈھائے تھے'' محترمہ کے یہ الفاظ پاکستانیوں کے سینوں میں خنجر کی طرح پیوست ہوئے کہ اُنہوں نے بھارت کی زبان استعمال کی ہے۔اب تک بنگالی محقّقین اور مصنّفین کی متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں جو بھارت کی تیار کردہ مکتی باہنی کے مظالم سے بھری پڑی ہیں اور پاکستانی فوج پر نسل کشی اور خواتین کی بے حرمتی کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کرتی ہیں کہ بھارت نے آزاد اور خودمختار پاکستان کے خلاف بین الاقوامی قانون کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے جارحیت کا ارتکاب کیا تھا جسے اب ''جنگِ آزادی'' کا نام دیا جا رہا ہے' پاکستان کی حفاظت میں لڑنے والے اب دار پر لٹکائے جا رہے ہیں جس کے خلاف پوری عالمی برادری کو آواز اُٹھانا اور ظالم کا ہاتھ روکنا چاہیے۔

مَیں ابھی اِسی اضطرابی کیفیت سے دوچار ہی تھا کہ نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی (نسٹ) کا ادبی مجلّہ نسٹیئن 2012ء موصول ہوا۔ پہلی ہی نظر میں نشاطِ روح کا سامان فراہم ہوگیا کہ اِس کے انتخاب' اِس کے مضامین اور پیشکش دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے چلے گئے جس میں ادب اور سائنس کا حَسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اِس کے مطالعے سے میرے اندر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے پایاں رحمت اور پاکستان کی عظمت اور اُس کے درخشندہ مستقبل پر ایمان تازہ ہوتا گیا۔ یہ یونیورسٹی اسلام آباد میں واقع ہے۔ چیف آف آرمی سٹاف اس کے بورڈ آف گورنرز کے چیئرمین ہیں' لیکن نسٹ انتظامی طور پر منسٹری آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی سے منسلک ہے۔الحمدللہ نسٹ سائنسی علوم کی تدریس وترویج میں انتہائی بلند مقام حاصل کرچکی ہے۔خوشی اور فخر کی بات ہے کہ ہماری پاک فوج سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ علوم و ادب کی پرورش اور ذہنوں کی تشکیل میں بھی قابلِ قدر کردار ادا کررہی ہے۔''نسٹیئن'' کے ایڈیٹر ممتاز اقبال ملک صحافت میں شاندار ماضی کے حامل ہیں۔مجلسِ مشاورت انجینئر محمد شاہد' ڈاکٹر آصف رضا اور

جناب محمود بشیر باجوہ پر مشتمل ہے۔ لکھنے والوں میں سید مشکور حسین یاد، سید حسنین کاظمی، صہبا اختر، ارون دتی رائے، ڈاکٹر انیس احمد، الطاف فاطمہ، امجد اسلام امجد، قدرت اللہ چودھری، پروفیسر فتح محمد ملک اور سلیم منصور خالد نمایاں ہیں۔ ''نسٹیئن'' میں حمدِ باری تعالیٰ بھی ہے، نعتیں، نظمیں، غزلیں، مزاحیہ اشعار اور خوبصورت افسانے بھی اور اذہان کو کشادہ کرنے والے مقالے بھی۔ گویا لطافتوں اور تخلیقی اُمنگوں کا ایک حَسیں مرقع ہے۔ نسٹ کے نظریاتی حصہ کے نمائندہ مضامین کو اگلے شماروں میں شامل کرنا ایک بہت بڑی قومی خدمت ہوگی۔ نسٹیئن کے اس شمارہ کا ہر ہر لفظ نویدِ کامرانی ہے۔ مثال کے طور پر اداریے کی آخری چند سطور: ''. . . انشاءاللہ قُدرتی وسائل، افرادی توانائی اور امکانات و مواقع سے لبالب پاکستان آباد رہے گا اور پاکستانی شاداب۔ عزیز طلبہ جہاں جہاں موقعہ ملے، اپنے علم و ہنر میں اضافے اور صلاحیت کو دو چند کرنے کے بعد آقاؐ سے محبتوں کے اجر میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ پاکستان میں آ کر اپنی صلاحیت اور تجربے سے پاک سرزمین کو شاد باد کریں۔ سایۂ خدائے ذوالجلال میں پرچمِ ستارہ و ہلال لہراتے ہوئے سُوئے منزلِ مراد بڑھے چلیں، بڑھے چلیں. . . . ''

مجھے ادبی مجلّے نسٹیئن سے بہت حوصلہ ملا ہے اور نویدِ کامرانی میری روح کے اندر اُترتی جارہی ہے کہ ظہورِ ترتیب کا حُسن ضَوفِشاں ہے۔

چار نکاتی عہد نامہ

ظہیر احمد

[احوالِ سندھ، روزنامہ پاکستان، 8 اپریل 2013ء]

گزشتہ سال کے آخری مہینوں میں جب میرا چھوٹا بیٹا پری انجینئرنگ کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد کسی اچھی یونیورسٹی میں داخلے کی تیاری کر رہا تھا تو ایک دن وہ اپنے دوستوں کی طرح نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا فارم لے کر آیا۔ مَیں نے بوجوہ اسے فارم بھرنے کی اجازت نہ دی اور وہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے این ای ڈی یونیورسٹی کراچی تک جستجو کرنے کے باوجود مہران انجینئرنگ یونیورسٹی جامشورو میں داخلے کے حصول میں کامیاب ہوسکا۔ اس دوران متعدد بار ہمارے گھر میں NUST کے معیار اور وہاں زیرِ تعلیم ہونہاروں کے بہتر مستقبل کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ رشک اور تعریف کے ساتھ ہونے والی اس گفتگو سے یہ ادارہ میرے لاشعور کا حصہ بن گیا تھا اور اس سوال کی صورت میں میرے شعور کے دروازے پر دستک ہونے لگی کہ الحمدللہ ہمارا ملک بھی نسٹ جیسے تعلیمی اداروں کا مالک بن چکا ہے! میرے تجسس اور جستجو میں خاموشی سے اضافہ ہوتا رہا۔ اسی دوران فروری کے آخر میں ایک دن NUST کے انتہائی دیدہ زیب ادبی میگزین نسٹیئن کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ حیرت ہوئی کہ یہ اہتمام کس دستِ عنبر حبیب نے کیا ہے اور وہاں کس کو میرے دل میں چھپی NUST کو جاننے کی خواہش کا علم ہوگیا ہے۔ مَیں بہت دن نسٹیئن کے مواد، حُسنِ انتخاب اور ترتیب کی مہارت میں کھویا رہا۔ میری زندگی کے 42 برس انتھک صحافت میں گزرے ہیں، خصوصاً جریدی صحافت سے قابلِ فخر تعلق رہا۔ پھر گزشتہ 22 برس سے اپنا ذاتی ماہوار جریدہ بھی مرتب کرتا اور چھپواتا چلا آ رہا ہوں جو لاہور کے تاثیر مصطفٰے کے بقول ''سولو جرنلزم'' کی پورے ملک میں واحد مثال ہے، لیکن نسٹیئن کی ورق گردانی کر کے غالب کی طرح بے ساختہ منہ سے نکلا:

''ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالب''

جب درِ حیرت پوری طرح وا ہو چکا تو رشک کے ساتھ حسرت نے بھی جنم لے

لیا کہ کاش میرا بیٹا NUST کا طالب ہوتا تو ''الحمدللہ'' کہتا اور ''ذکرِ رسولِ کریمؐ'' سے اپنے کردار کی آبیاری کرتے ہوئے ''مقبول'' ہوکر ''رخِ آفتاب'' سے قلب کو منور کر کے ''رشکِ چمن'' بن جاتا' پھر اس کے ''بدلتے رنگ'' دیکھ کر ہم منتظر ہوتے کہ ''دیکھئے اِس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا'' لیکن ''سائنس'' کے علم کے ذریعے کسی ''جہانِ نو'' کو دریافت کرنے سے پہلے وہ اپنی ''گفتارِ شیریں'' کا جادو بھی جگاتا اور ''بزمِ ادب'' میں ''شعلۂ آواز'' کے سحر اور اچھے لفظوں کی ''موتی مالا'' کے ذریعے ''بیانِ فطرت'' پر اتنی دسترس کا مظاہرہ کرنے کے قابل ہو جاتا کہ ''فسانے'' سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ اس کی داستانِ حیات کو سنا جاتا۔

جی ہاں! آپ سمجھ گئے' یہ نسٹیئن کے اُن چند ابواب کے عنوانات کا حوالہ ہے' جن کی خوبصورت ترتیب نے میرے دل میں اُڑ کر وفاقی دارالحکومت پہنچنے اور اس ادارے کے منتظمین سے ملنے کی خواہش بڑھا دی ہے۔ ممتاز اقبال ملک دو عشروں سے زیادہ افواجِ پاکستان کے رسالے ''ہلال'' کے ایڈیٹر رہے ہیں' لہٰذا اِن کا تجربہ نسٹیئن کے ورق ورق سے عیاں ہے' نسٹیئن کے ذریعے دنیا سنوارنے کے ساتھ ساتھ نوجوانانِ وطن کی کردار سازی کے ذریعے نسٹ میں دین کی بھلائی کا جو کام کیا جا رہا ہے اس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

میری جستجو کے شوق نے مجھے بتایا کہ NUST کے ریکٹر (وائس چانسلر) انجینئر محمد اصغر پاک فوج کے ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل ہیں۔ پیشہ ورانہ مہارت کے حامل' ادب پرور' علم دوست' اقبالؒ کے شیدائی' قائدِ اعظمؒ کے سپاہی' رومیؒ کے فدائی' با اُصول اور دیانتدار شخص کی شہرت رکھتے ہیں' ان کی موجودگی میں اسی طرح کا مجلّہ ہی ترتیب پانا چاہئے تھا کہ ملک بھر کے نامور کالم نگار اسے خراجِ تحسین سے نوازیں۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا کہ کسی تعلیمی ادارے کے مجلّے پر کالم لکھے گئے ہوں اور وہ بھی نامور قلم کاروں کے قلم سے۔ البتہ تبصرۂ کتب کے صفحات میں چند سطری اور بے معنی تبصرے نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ نسٹیئن کی دیدہ زیب طباعت' مضامین کے انتخاب اور حُسنِ ترتیب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے مستقبل میں ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے قابلِ فخر نوجوانوں کو نا اُمیدی اور مایوسی کے اندھیروں سے نکالنے کی کوشش دل نشیں اور پُر اثر انداز سے کی گئی ہے۔ صرف چند ہفتے قبل تک چہار سُو مایوسی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہماری قوم قیادت کے جمہوری انتخاب کا محفوظ مرحلہ کس طرح طے کرے گی' لیکن اب یہ بادل چھٹ رہے ہیں اور جس طرح مشرق سے اُبھرنے والے سورج کی مدھم' لیکن چمکتی کرنیں اُن پگڈنڈیوں کو واضح کر کے' جنہیں اندھیرے میں دیکھنا ممکن نہیں ہوتا' شاہراہ تک پہنچنا آسان بنا دیتی ہیں' اسی طرح نسٹیئن کے اداریے میں مہینوں پہلے قومی سفر کی سمت کو یقینِ محکم کے ساتھ یوں واضح کر دیا گیا:

''. . . انشاء اللہ تعالیٰ پاکستان آباد رہے گا اور پاکستانی شاداب' رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے تصرّف' توجہ' عطا اور نگاہ کا آغاز ہو چکا ــــ اور یہ دُور کا نہیں' مستقبل قریب کا منظر نامہ ہے۔ . . . .''

مہینوں بعد نسٹیئن کے الفاظ پر نظر ڈالنے کی فرصت ملی تو میں سوچنے لگا کہ ہمیں شاید ایسے ہی قلندر صفت اور مجذوب لوگوں کی ضرورت ہے جو تصویر کا روشن پہلو نمایاں کر کے یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے جہادِ زندگانی کی شمشیریں تیار کرنے کا سامان کرتے ہیں اور ہاں! ذرا اداریے کے ان الفاظ پر بھی نظر ڈالیے:

''. . . پاکستان اللہ تعالیٰ کی منشا سے قائم ہوا اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ہی اس کی محافظ و دستگیر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے عطا کردہ پاکستان کو ہمیشہ یا لمبے عرصے کے لئے کسی مصیبت یا آزمائش یا سزا سے دوچار نہیں رکھے گا' پاکستان کے استحکام کے لئے جو کوئی بھی کوشش کرے گا' وہ اللہ تعالیٰ کی

خوشنودی پائے گا۔جس شخص یا گروہ نے اس ملک میں اپنی کبریائی کا تخت بچھانے کی کوشش کی—ہم دیکھ چکے ہیں—وہ نشانِ عبرت بنا۔اس لئے اندرونی و بیرونی شر، تخریب، من مانی اور منہ زوری کے اندھیروں سے ہرگز بددل نہ ہوں. . . .''

اس کے بعد نسٹیئن کے اداریے کے ذریعے نوجوانانِ وطن کو چار نکاتی چارٹر دیا گیا ہے کہ''. . .یہ چار کام کر کے ملکِ خداداد کے انتظام وانصرام کا معاملہ خالق و مالک پر چھوڑ دیں:

اول: مطالبۂ پاکستان کے وقت اللہ تعالیٰ سے کئے گئے وعدوں پر عمل پیرائی کا مظاہرہ ۔دوئم: اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت— اسلامی جمہوریہ پاکستان— سے بے لوث وفاداری اور اس کے اساسی نظریے کی کارفرمائی و تحفظ کا حق ادا کرنا۔سوئم: زبان، قبیلے، طبقے اور صوبہ پرستی کی بدروح کو ذہن اور سوچ میں گھسنے نہ دینا۔چہارم: دورانِ تعلیم اپنی تمام تر توجہ تعلیم پر بعد ازاں عملی زندگی کے میدان میں آ کر کام، کام، کام اور خدمتِ مُلک وعوام. . . .''

پاکستان کی مجموعی صحافت کو عموماً اسی طرح تصویر کے روشن پہلو کو اُجاگر کرنے کا کام کرنا چاہیے تھا، مگر وہ 'انسان نے کتے کو کاٹ لیا' کے مصداق عموماً منفی پہلو کو اُجاگر کرنے والے واقعات ہی کو خبر سمجھتے ہیں اور یہ بھی مایوسی و نا اُمیدی کا ایک سبب ہے۔اس لحاظ سے نسٹیئن نے نہ صرف ملک بھر کی یونیورسٹیوں کے طلباء و طالبات کے لئے چار نکاتی عہد نامے کی مشعل روشن کی ہے، بلکہ پاکستان کی صحافت کے لئے بھی راہ متعین کر دی ہے۔اس پر دل سے بے ساختہ نکلتا ہے: شاباش نسٹ! کیا ہی اچھا ہو کہ نسٹ میں شامل ملّی افکار کی حامل تحریریں آئندہ شماروں میں شائع کی جاتی رہیں، کیونکہ ہر سال طلبہ کی ایک کھیپ جاتی اور نئی آجاتی ہے، انہیں بھی ان خیال افروز تحریروں سے مستفید کرنا چاہیے۔

کتاب نما

سلیم منصور خالد

[ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن، مئی 2013ء]

تعلیمی اداروں میں طلبہ و طالبات کے سالانہ مجلّوں کی اشاعت ایک دیرینہ روایت ہے۔ یہ ہر ادارے کے طالب علموں کی ذہنی و فکری تربیت اور تخلیقی قوتوں کے اظہار کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کے اکثر ادارے ایسے رسالے شائع کرتے ہیں جن کے مندرجات میں اسلامی تہذیب سے بغاوت، تعمیری افکار سے نجات اور خود پاکستان کے وجود کے بارے میں تشکیک و تذبذب کے جرثومے موجود ہوتے ہیں۔

ذہنی شکست خوردگی اور تہذیبی شکست و ریخت کے اس ماحول میں نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی (نسٹ) اسلام آباد کے ادبی مجلّے نسٹیئن کا دوسرا شمارہ (2012ء) اپنی نوعیت کا ایک منفرد اور پاکستانی مُسلم تشخص کا نمائندہ محسوس ہوتا ہے۔تعمیرِ پاکستان کے ساتھ ساتھ تخلیق و تہذیب کے باب میں پاکیزگی اور شائستگی کا حوالہ بن کر وطنِ عزیز کے تعلیمی اداروں کے ادبی مجلّوں کے لیے ایک روشن مثال کا درجہ رکھتا ہے۔اس میں وہ سب کچھ ہے جو کسی اچھے ادارے کے معیاری رسالے میں ہونا چاہیے۔نگارشاتِ نظم و نثر، علمی، معلوماتی اور ادبی نوعیت کی ہیں۔ادب کی جملہ اصناف کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔انگریزی حصے میں بھی وقیع تحریریں شامل ہیں۔نسٹیئن کی ترتیب و ادارت چوتھائی صدی تک افواجِ پاکستان کے ہفت روزہ ہلال کی ادارت کے اعزاز یافتہ ممتاز اقبال ملک نے کی ہے اور اس عمل میں نسٹ کے علم دوست ریکٹر انجینئر محمد اصغر کی رہنمائی اس دستاویز کے ظہور کا ذریعہ بنی ہے، جس پر وہ مبارک باد کے حق دار ہیں۔

پاکستانیت کی خوشبو

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

[بے نیازیاں، روزنامہ نوائے وقت، 16 مئی 2013]

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی (نسٹ) کا علمی و ادبی مجلّہ نسٹیئن 2012ء میری نظر سے گزرا تو میرا دل اس آرزو سے بھر گیا کہ سارے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کے ادبی میگزین ایسے ہی ہونا چاہئیں۔ پاکستانیت کی خوشبو لفظ و خیال کی دنیا میں بکھری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ عشقِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کا سرچشمہ ہے اور یہی ایمان ہے۔ دیکھنے میں پسندیدہ اور پڑھنے میں گرویدہ کرنے والی پوری ادائے دلبرانہ سے لبریز اشاعت۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے دل و دماغ کی مکمل صلاحیتوں کو آزمانے والے طالب علموں کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت، شاندار اور بامقصد رسالہ ہو تو وہ بے قرار ہوں گے اور سرشار بھی ہوں گے۔ الحمدللہ رب العالمین اور ذکرِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آغاز پانے والے اس میگزین میں پندرہ عنوانات کے ساتھ ایک سو کے قریب مضامینِ نظم و نثر شامل ہیں۔ ہر حصے کے شروع میں علامہ اقبالؒ کا شعر درج کیا گیا ہے۔ تابندہ باد کے حصے میں یہ شعر آیا ہے:

زمیں سے نُوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

پہلی تحریر کا نام "پاک سرزمین شاد باد" ہے اور اس کی ابتدا میں قومی ترانہ دیا گیا ہے۔ تحریر پر کسی کا نام نہیں، یہ سب کی ملکیت تحریر ہے کہ اس میں قومی ترانے کے انتخاب و تدوین اور منظوری تک کی مصدقہ تفصیلات دی گئی ہیں۔ دوسری تحریر کے لئے بھی کسی کا نام درج نہیں۔ میگزین کے اداریے پر بھی کوئی نام نہیں جس کا عنوان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ ظاہر ہے یہ سب تحریریں ایڈیٹر "نسٹیئن" ممتاز اقبال ملک ہی کی ہیں۔ ممتاز سے میری رفاقت بہت پرانی ہے۔ وہ جانتا ہے اور گواہ بھی ہے کہ میں نے پاکستان کو خطۂ عشقِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہا ہے۔ اس تحریر کا اختتام بھی اقبالؒ کے شعر پر ہوتا ہے:

پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام

اس رسالے میں ایک حصے کا نام سائنس ہے۔ جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے طلبہ و طالبات کے ذوق و شوق کا سارا سامانِ سفر موجود ہے۔ اس پورشن کے آغاز کے لئے حضرت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر درج ہے:

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور

مَیں گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی میگزین "راوی" کا ایڈیٹر رہا ہوں۔ تب گورنمنٹ کالج ایشیا کے چند بہترین تعلیمی اداروں میں سے ایک تھا۔ "راوی" کے ساتھ نامور اور بڑے لوگ وابستہ رہے ہیں۔ اُس وقت اس کے مقابلے میں کوئی کالج میگزین اور یونیورسٹی کا ادبی مجلّہ نہ آتا تھا۔ میرے مرتب کردہ غالب نمبر اور اقبال نمبر پر متعدد غیر ملکی نشریاتی اداروں نے بھی تبصرے کئے تھے۔ ممتاز میرا معاون تھا۔ میں نے تعلیم اور تدریس میں عمر گزاری ہے۔ اکثر جگہوں پر ادبی مجلوں کا نگران رہا ہوں۔ انہیں "راوی" کی روایت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے پہلے پنجاب یونیورسٹی کے ادبی مجلّہ "محور" سے چیف ایڈیٹر اور چیئرمین میگزین بورڈ کی حیثیت سے وابستہ رہا ہوں۔ وہاں بھی ممتاز میرے ساتھ تھا اور میرے بعد "محور" کا چیف ایڈیٹر اور چیئرمین میگزین بورڈ بنا۔ میرا

خیال ہے کہ یہ اشاعت ''راوی'' سے کم نہ تھی۔اس کی صورت اور اُٹھان ممتاز نے ایسی ہی بنائی تھی جو آج نسٹ کے ادبی مجلّے ''نسٹیئن'' کی نظر آتی ہے۔ گورنمنٹ کالج کے طلبہ و طالبات کو راوین کہا جاتا ہے۔''نسٹیئن'' بھی اسی روایت کا مظہر ہے اور اُسے آگے لے جانے کی کامیاب کوشش ۔الحمدللہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہمارے نوجوان اپنی صلاحیتوں کو ثابت کر رہے ہیں۔ان کے دل و دماغ کو پاکستانیت کی خوشبو سے بھر دینا چاہئے' وہ کچھ بھی ہو جائیں مگر پاکستانی رہیں۔اس کے لئے نصابِ تعلیم کے علاوہ ادبی میگزین کے ذریعے بڑی آسانی اور آسودگی سے کامیابی ممکن ہے۔ ''نسٹیئن'' کا یہ شمارہ مثال کے طور پر بڑے فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔یہ کالم نسٹیئن پر تبصرے کے لیے نہیں لکھا جا رہا' نہ ہی مجلّوں پر کالم لکھے جاتے ہیں' اس کے لیے تبصرۂ کتب کے کالم مختص ہیں۔'' نوائے وقت'' نے تو پاکستان اور اس کی نظریاتی سرحدوں کی پاسبانی کے لئے ''نسٹیئن'' میں شائع ہونے والے ایک ایک حرف پر شاباش دینے کا فرض نبھایا ہے۔''نسٹیئن'' پر کالم اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ دوسرے تعلیمی ادارے بھی اس کی تقلید کریں۔نسٹ کو نئے علوم بلکہ علوم کے ہجوم' حیران کُن لیبارٹریز اور پاکستانی ماحول نے وہ مقام دلایا ہے کہ اسے تعلیمی اداروں کے معیار کی عالمی رینکنگ میں عالی مقام حاصل ہو گیا ہے۔نسٹ کے بورڈ آف گورنرز کے چیئرمین چیف آف آرمی سٹاف ہیں۔نسٹ اور آرمی چیف' ہر دو کے لئے باعثِ اعزاز ہے۔گزشتہ اپریل میں سیاچن کے برف زاروں میں زندہ دفن ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جانے والے عسکریوں کے لئے پاک فوج کے دلیروں نے اَن تھک جدّ وجُہد کی۔شہیدوں تک پہنچنے میں پاک فوج کے افسران اور جوانوں کا ایثار بے مثال معرکہ آرائی ہے۔ہزاروں ٹن برف کے نیچے آبادان جنتّیوں کے ٹھکانے کی نشاندہی نسٹ کے طالب علموں نے کی۔یہ کسی بھی یونیورسٹی کے لئے فخر کی بات ہے۔علم و فن میں کمال کے ساتھ یہ بھی کمال ہے کہ ان پاکستانی طلبہ کو شہادت کا رتبہ پانے والے عسکریوں کی خوشبو نے روشنی دکھائی۔ مجھے لگتا ہے کہ سائنسدان اور صوفی میں فرق نہیں۔دریافت اور ایجاد اَن دیکھے جہانوں اور زمانوں کے ساتھ رابطے کے بغیر ممکن نہیں۔میں یہ بھی کہتا ہوں کہ فزکس (طبیعیات) میٹافزکس (مابعد الطبیعیات) کو ثابت کرتی چلی جا رہی ہے۔پاکستان کے سائنسدان دنیا بھر کے سائنسدانوں سے یقیناً مختلف اور منفرد ہوں گے۔اس میں قابلِ ذکر بلکہ ناقابلِ فراموش کردار نسٹ کا بھی ہوگا۔ان شاءاللہ تعالیٰ ہمارا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

آخر میں مجھے نسٹ کے ریکٹر لیفٹیننٹ جنرل محمد اصغر کا ذکر کرنا ہے کہ انہوں نے نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی میں پاکستانیت کے پھلنے پھولنے کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنے کی خاطر عہد ساز کام کیا ہے۔''نسٹیئن'' کی ترتیب و اشاعت اس کی گواہی دے رہی ہے۔ پاکستان' مفکرِ پاکستان اور بانی پاکستان کے سپاہی اور افواجِ پاکستان سے وابستگیوں کے ساتھ ساتھ علمی ذوق وشوق کے جذبے کے فروغ کے لئے بھی تڑپ رکھتے ہیں۔اقبالؒ ان کی رگوں میں خون کی طرح رواں ہے۔متعدد کتب کے مترجم اور مصنف ہیں۔یونیورسٹی کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ایک خاص مقام دلانے کے لئے انہوں نے بہت مثبت کوششیں کی ہیں۔

میری خواہش ہے کہ ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں اور بلند پایہ لائبریریوں میں ''نسٹیئن'' کی فراہمی ممکن بنائی جائے تاکہ تعلیمی اداروں میں بامقصد' بامعنی ادبی میگزین شائع کرنے کا شعور اور شوق پیدا ہو جس سے طلبہ اور طالبات کے ساتھ ساتھ عام پاکستانی بھی مستفید ہوں اور محظوظ بھی۔

سائنس اور ادب — نسٹیئن کے حوالے سے ایک غلط فہمی کا ازالہ

پروفیسر سیّد مشکور حسین یاد

[*ماہنامہ اخبارِ اردو، نومبر 2013ء]

کالجوں کے ادبی مجلّوں سے میرا عملی اور جذباتی تعلق ہے۔ اسی لیے سائنسی تعلیم کے ایک ادارے کے ادبی مجلّے پر لکھنے کے لئے خود کو مجبور پاتا ہوں۔

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی المعروف نسٹ' کا ادبی مجلّہ نسٹیئن میرے سامنے ہے اور مَیں مسلسل حیران ہو رہا ہوں کہ سائنس کے طلبا ایسا وقیع ادبی مجلّہ نکال سکتے ہیں تو یہ جو یار لوگوں نے اُڑا رکھی ہے کہ سائنس کا ادب سے تعلق برائے نام ہوتا ہے' اُس میں گہرائی اور گیرائی اور پہنائی نہیں' یہ سراسر جگ ہنسائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ایک سائنسدان اس طرح خیالی پلاؤ نہیں پکا سکتا جس طرح ایک ادیب یا ادبی ذوق رکھنے والا شخص زمان و مکان کو اِدھر کا اُدھر اور اُدھر کا اِدھر کرتے ہوئے اپنا فن دکھا سکتا ہے۔ سائنس براہِ راست سامنے کے حقائق کو قابو میں رکھنا چاہتی ہے' اگر قابو نہ پایا جا سکے تو کم از کم اُنہیں اپنی نگاہ میں رکھتی ہے' لیکن ان تمام حقائق کے باوجود نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کے ادبی مجلّہ میں وہ سب کچھ پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے جو ادب اپنے قاری کو مہیا کرتا ہے۔

بہت سے ادبی جرائد کو ہم پڑھتے ہیں لیکن اِن کا کچھ پتا نہیں چلتا' اور پتا چلتا بھی ہے تو اتنی جلدی سے نہیں جس قدر نسٹیئن کا۔ اس کا کوئی سا بھی صفحہ اپنے قاری کو بغیر پڑھے آگے نہیں جانے دیتا۔ جس طرح اِس پرچے کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے' اُس سے یہ تقسیم ہونے کے بجائے مزید واحد ہو کر سامنے آیا ہے۔ ہر حصے کی نشاندہی کے لیے امتیازی ورق (سپریٹر) پر علامہ اقبالؒ کا حسبِ حال شعر دیا گیا ہے۔ اس حصے کے موضوع کی عمدہ تصوراتی تخلیق اور ڈیزائننگ کمالِ فن کا لاجواب شاہکار ہیں۔ موزوں و برمحل اشعار کے انتخاب پر کتنی محنت کی گئی؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ بے شک یہ پرچہ نسٹ کی علامہ اقبالؒ سے محبتوں کا عنوانِ جلی ہے۔

سب سے پہلے حمد کے حصہ — الحمد للہ رب العالمین — میں بالکل اچھوتی سوچ اور ادبی ذوق کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف ایک ہی شاعر کی کئی حمدوں کو مجتمع کیا گیا ہے۔ ہر حمد' حمد و ثنا کے روایتی انداز سے بہت ہی مختلف قسم کی حمد ہے۔ ان سے حمد و ثنا کے بہت سے پہلو ہمارے سامنے آ کر ہمارے قلب و نظر کو حکمت و عقیدت سے بہرہ یاب کرتے ہیں۔

پھر ذِکرِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اس میں شاہ احمد رضا خانؒ کا بے حد مشہور اور معروف سلام بھی ہے جس کی رَدیف لاکھوں سلام ہے۔ یہی ایمان افروز سلام' جس کو ہم نجانے کتنی بار پہلے پڑھ چکے ہیں' ہر روز سنتے ہیں' مگر جب اِس مجلّہ میں پڑھتے ہیں تو نیا لُطف آتا ہے۔ ذکرِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کر کے قاری خود کو قریۂ حُبِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضاؤں میں موجود پاتا ہے۔ چند سطور پڑھ لیجئے: ''... نبی کریمؐ کی رحلت کے بعد حضرت بلالؓ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طلب فرمانے پر ملک شام سے مسجد نبویؐ میں پہنچے ہیں۔ حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے اصرار پر اذان دیتے ہوئے **اشھدان محمد رسول اللہ** کہتے ہوئے بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں۔ اذانِ بلالؓ سُن کر اہلِ مدینہ روتے دھوتے مسجدِ نبویؐ کی جانب لپکتے ہیں۔ ننھے منے بچوں کا بے حال ماؤں سے پوچھنا کہ ماں' ماں! بلالؓ تو آ گئے' کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مدینے آ جائیں گے' بلکوں کو آنسو تھامنے کی قوت سے محروم کر دیتا ہے....''

* اِدارۂ فروغِ قومی زبان' (مقتدرہ قومی زبان) حکومتِ پاکستان کا جریدہ

اس طرح ''ایسی محبت اِتنی محبت!'' میں جانثارانِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی آقاؐ سے وفاؤں کے بے بدل واقعات کی تفصیل لخت لخت روح اورنڈھال جسم وجاں کو یکدم توانا و بحال کر دیتی ہے کہ الحمدللہ! ہم وارث ہیں ان جذبوں کے۔ اللہ تعالیٰ اور ذکرِ رسولِ کریمؐ کے بعد مدیرنسٹ ممتاز اقبال نے وطن کو پیش پیش رکھا ہے۔ یہ حصّہ ''تابندہ باد'' ہے جہاں پاکستانیت مہک رہی ہے۔ دوقومی نظریے' نظریۂ پاکستان' پاکستان' بانیانِ پاکستان' مسئلہ کشمیر' امن کی آشا' دفاعِ پاکستان اور ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو کچھ لکھا اور کہلوایا جا رہا ہے' نسٹیئن نے ہر لفظ کا شائستگی اور دلیل سے جواب دے کر لاجواب کیا۔ قائدِ اعظمؒ اور مشاہیرِ پاکستان کے حصے کا عنوان ''رُخِ آفتاب'' ہے۔ رُخِ آفتاب میں قائدِ اعظمؒ کو سیکولر ہونے کی گالی دینے والوں کا مؤثر آپریشن کیا گیا ہے۔ یہیں ہماری ملاقات راجہ تری دیورائے سے ہوتی ہے: ''... متحدہ پاکستان کے آخری عام انتخابات میں جناب نورالامین اور چٹاگانگ میں آباد چکما قبیلے کے سربراہ راجہ تری دیورائے عوامی لیگ کے بھارت نژاد سیلاب کا منہ پھیر کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور جناب نورالامین کی طرح ''بنگلہ دیش نامنظور- پاکستان زندہ باد'' کا نعرۂ مستانہ بلند کرتے راج گھاٹ چھوڑ کر پاکستان میں آ بسے۔ حُبِّ وطن کی زندہ تصویر میں جناب محمود علی' خواجہ خیرالدین' جناب شفیق الاسلام وغیرہ بھی شامل ہیں جو بنگلہ دیش سے منہ موڑ کر اپنے وطن اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ہو کر رہ گئے' اور یہیں آسودۂ خاک ہیں۔

خدا رحمت کُند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بنگلہ دیش کو اقوامِ متحدہ کی رکنیت دلوانے کے لیے جنرل اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ صدرِ پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے راجہ تری دیورائے کو پاکستانی وفد کی قیادت اور پاکستان کی ترجمانی کا علَم سونپا۔ مجیب الرحمٰن نے بنگلہ دیشی وفد میں جواں سال راجہ کی معمر والدہ محترمہ کو شامل کیا۔ سرکاری طور پر پیش کش کی گئی کہ بنگلہ دیش چکما علاقے کی داخلی خودمختاری اور آپ کو اس کا جائز اور قانونی راجہ تسلیم کرے گا' آپ پاکستان کی وکالت نہ کریں۔ راجہ نے مختصر جواب دیا: ''مَیں پاکستانی ہوں''۔ بھارت نواز عالمی لابی کی ہر کوشش بنگلہ دیش کو رکنیت نہ دلوا سکی۔ فتح یاب راجہ چک لالہ ائیرپورٹ پر اُترے تو صدر ذوالفقار علی بھٹو' جو اپنی پوری کابینہ کے ساتھ اس مردِ بے پناہ کے استقبال کے لیے موجود تھے' جھپٹ کر راجہ تری دیورائے سے لپٹ گئے۔ محبِ وطن پاکستانی راجہ تری دیو رائے نے کہا: ''جنابِ صدر! بہت شکریہ اس اِکرام کا' پذیرائی اور اہتمام کا۔ آپ نے شدید موسم میں تکلیف اُٹھائی۔ میں نے جو کیا' وہ ہر پاکستانی کا فرض ہے۔ میں یہیں جیوں گا' یہیں مروں گا۔'' صدرِ پاکستان نے رُندھی آواز میں کہا: ''جو آپ نے کیا' وہ کوئی نہیں کر سکتا' آپ پاکستان کے سدا بہار مُحسن ہیں۔'' بعد ازاں راجہ تری دیورائے نے لاتعداد ممالک میں پاکستان کی سفارت کی ذمہ داریاں نبھائیں اور اس شان سے کہ وہاں کبھی بھی بنگلہ دیشی سفارت خانے کی کسی بھی تقریب میں شرکت نہ کی۔ چند برس سے مستقلاً پاکستان میں مقیم تھے۔ پاکستان کو درپیش حالات سے دل گرفتہ رہنے لگے۔ پاکستان میں جینے اور پاکستان میں مرنے کے عہد کو وفا کرتے ہوئے 17 ستمبر 2012ء کو پاکستان کے ہنگامہ خیز دارالحکومت اسلام آباد کے ایک خاموش کونے میں سپردِ خاک ہو گئے! بات طویل ہو رہی ہے بس اتنا ہی پوچھوں گا کہ اس سچے پاکستانی کے لیے بھلا کتنا کچھ کہا یا لکھا گیا....''

حصہ نظم کے ساتھ ساتھ مقالوں اور افسانوں میں بھی کشمیر اور کشمیریوں کو توانا انداز میں یاد رکھا گیا ہے۔ ''بزمِ ادب'' کا آغاز حفیظ تائب کی نعت

پر ایک بھرپور مقالے سے ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کو ''پیامبرِ اُمید'' کہہ کر عصرِ حاضر کے نومید نوجوانوں کو علامہؒ کی زبانی پیامِ زندگی دیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ سے خواب میں مدیر کی ملاقات بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ملک وقوم کو درپیش مسائل کے حوالے سے مدیر کے سوالوں کا جواب علامہ اقبالؒ کے رہنما شعروں کی صورت میں درج ہے۔

قیامِ پاکستان اور دفاعِ پاکستان کے غازیوں اور شہیدوں کو پاکیزہ خراجِ عقیدت بھی شاملِ اشاعت ہے۔'' . . . دنیا کے بلند ترین محاذِ جنگ (سیاچن) پر سات اپریل 2012ء کو ایک ہولناک برفانی پہاڑ نے پاک فوج کے 140 مجاہدوں کو نگل لیا۔ پاک فوج کے مردانِ دلیر اگلے ہی روز بے رحم موسم اور خونخوار برفانی پہاڑ سے بھڑ گئے اور آج سے دو روز قبل تک 133 شہیدوں کے جسدِ خاکی خونیں پہاڑ کے جبڑوں سے نکال لائے۔ ایثار ومحبت کی بے مثل مہم جاری ہے۔ کتنی اور کس نوعیت کی قربانیاں دے کر؟ محبتوں میں حساب کتاب، جمع تفریق نہیں ہوتی . . . .'' اس سلسلے میں نسٹیئن میں بڑی ہی پُرتاثیر تحریریں شامل ہیں۔ دفاعِ پاکستان کے حوالے سے نسٹیئن میں شامل پروفیسر مرزا محمد منوّر مرحوم کے ایک چشم کشا مضمون کی چند سطریں: '' . . . اپنی کتاب Inside Story of Hinducracy میں اجیت سنگھ ڈھلوں انکشاف کرتے ہیں کہ ڈی پی دھر اور پی این ہسکر نے سپین جا کر مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب جمع کئے اور ان کے تجزیے کرتے رہے۔ پھر انڈیا آفس لائبریری لندن میں خفیہ سروسز کے کاغذات چھان پھٹک کر پاکستان کی فوجی قوت کو محدود کرنے کی تدابیر سوچیں۔ ان کی مرتب کردہ طویل رپورٹ کے یہ نکات آج بھی بھارت کی ہر حکومت کی سرکاری پالیسی کا حصہ ہیں:

(1) حُبِّ پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں کے جسم وجاں سے نکال لی جائے۔ اس کے لئے پاکستان کی جہاد مخالف قوتوں، خصوصاً مسلمانوں کے آخری نبی (حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد نبوت کے دعویدار کو ماننے والے گروہ کو مضبوط کیا جائے، آگے بڑھایا جائے اور کام میں لایا جائے۔ (2) پاکستان کے اندر بھارت سے دوستی کی تحریک اور بھارتی ثقافت کو فروغ دینے والے پاکستانیوں کا ایک ایسا ٹولہ تیار کیا جائے جو اثر ورسوخ کا حامل ہو۔ (3) پاکستان کے اندر پاکستانیوں پر مشتمل افواجِ پاکستان مخالف لابی قائم اور مستحکم کی جائے جو دفاعِ پاکستان کے لئے مخصوص کیے جانے والے وسائل کے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ اور ہنگامہ آرائی کرتی رہے اور اپنی افواج کے خلاف نفرت پھیلا کر افواج کو شہریوں کی محبت سے محروم کرنے میں کوشاں رہے . . . .''

اس کے بعد کے عنوانات بھی اپنے موضوع ومضامین کے اعتبار سے خُوب لُطف اندوز ہونے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً رشکِ چمن، بدلتے رنگ، بیانِ فطرت، شعلۂ آواز، موتی مالا، گفتارِ شیریں، جہانِ نَو اور انتظار یہ وغیرہ وغیرہ۔ افسانے پڑھئے تو پتا چلتا ہے کہ مدیر نے باقاعدہ پڑھ کر اِن کو منتخب کیا یا باضابطہ درخواست کر کے لکھوایا ہے۔ یہ ادب برائے ادب نہیں، ادب برائے زندگی کی تفسیر ہیں۔ پاکستانیت اور حُبِّ وطن سے لبالب تحریریں افسانوی انداز میں راہِ راست دکھا رہی ہیں نوجوانوں کو۔ آخر میں ''انتظار یہ'' ہے، اس میں وہ تحریریں شامل ہیں جو جریدے کی اشاعت کے دوران موصول ہوئیں اور اپنی افادیت کے پیشِ نظر اس میں شامل کی گئیں۔

شعروادب پر سائنس اور آرٹس کے طلبہ کے مالکانہ استحقاق یا حقِ وراثت کا مقدمہ برس ہا برس سے ادبی پنچائتوں میں زیرِ سماعت ہے۔ مَیں نسٹیئن کی

زیرِ نظر مثل کے بغور مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جیسے عشق کسی کی میراث نہیں، شعروادب بھی صرف آرٹس کے طلبا کا موروثی یا خاندانی ورثہ یا جائیداد نہیں۔ مجھے نسٹیئن کی کسی نثری تحریر یا شعری تخلیق میں کوئی جھول نظر نہیں آیا۔ ''جہانِ نو'' میں آٹھ صفحات پر مشتمل ''نسٹیئن بیاض'' یعنی طلبا کے پسندیدہ اشعار میں سے کوئی ایک بھی وزن اور اخلاق سے گرا ہُوا نہ پایا گیا۔ قابلِ ستائش پہلو یہ کہ ہر شعر بلند پایہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حق بحق دار رسید کے خصوصی اہتمام سے ہر شعر کے ساتھ حقیقی شاعر کا نام درج ہے۔

اس کے خصوصی تذکرے کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے۔ مشرقی علوم کے ایک بہت بڑے ادارے کے سالانہ مشاعرے میں مہمان شعرا میں فیض صاحب بھی شامل تھے۔ ایم اے فائنل کی ایک طالبہ نے اُن سے عرض کیا: '' جنابِ محترم ! بمہربانی اپنی وہ مہدی حسن والی غزل عطا فرمایئے۔ وہی پُھولوں میں رنگ بھرے اور پتہ نہیں کونسی بہار چلے والی''۔ صاحبزادی کا اشارہ فیض صاحب کی ایک مشہور غزل جسے مہدی حسن نے گایا تھا، کے اس شعر کی جانب تھا:

گُلوں میں رنگ بھرے بادِ نَو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

اس پس منظر میں نسٹ کے طالب علم واقعتاً شاباش کے حق دار ہیں۔

ایک محفل میں کچھ احباب نے ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) کے بارے میں کہا کہ وہ نسٹ کو اس کے حق سے زیادہ فنڈز فراہم کرتا ہے۔ اب جو نسٹیئن کے آئینے میں دیکھا تو قرار آیا کہ یہاں صرف ادبی مجلّے، تحقیقی جرنل، ہوشربا ریسرچ، نصابی وہم نصابی سرگرمیاں ہی نہیں، ہر تفویض شدہ مشن خونِ جگر دے کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔

گزشتہ دنوں اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نسٹ میں آئے۔ اس سے پہلے بوسنیا اور مصر کے سربراہانِ مملکت کو نسٹ نے اعزازی ڈگریاں دیں۔ فیصلہ سازوں نے یہ مشن یہ حقیقت سامنے رکھ کر نسٹ کو سونپے کہ نسٹ میں ہر کام سلیقے، قرینے اور بہتر طریقے سے کیا جاتا ہے۔

نسٹیئن کی ترتیب، ادارت اور پیشکش کی سب ادائیں نسٹیئن کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے میں مدد دیتی ہیں کہ اس کے تمام جلوے، حرف اور نقطے اسلام، پاکستان، علامہ اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ، کشمیر، دفاعِ وطن، ایٹمی اثاثوں کی حفاظت، بھارتی آبی جارحیت اور ملک وقوم کو درپیش اندرونی مسائل اور بیرونی سازشوں جیسے معاملات پر انتہائی جرأت مندانہ انداز اور الفاظ میں ملّی موقف کا اعلامیہ، اظہاریہ اور بیانیہ ہیں۔ پاکستان کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے والوں کی خوب خوب خبر لی گئی، مگر حقائق اور تاریخی حوالوں سے۔ یوں یہ صرف ادبی نہیں، ملّی افکار مستقل نوعیت کا ترجمان اور مستند دستاویز ہے۔ نظریاتی صحافت کی زندہ مثال اور بے خوف علامت کی اِدارت میں ایسا ہی جریدہ منظرِ عام پر آنا چاہیے تھا۔

اتنے بامقصد مواد، جاذبِ نظر لے آؤٹ، خوش کُن تزئین، انتہائی عمدہ پرنٹنگ اور بے عیب پروڈکشن کے لیے درکار وسائل کی فراخدلانہ فراہمی جیسے متعدد امتیازات سے مالا مال نسٹیئن نے جدید ترین سائنسی علوم کی تعلیم میں مسلسل آگے بڑھنے والی یونیورسٹی نسٹ کو تعلیمی اداروں کے ادبی مجلّوں کے معیار کے وکٹری سٹینڈ پر بھی بلند مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ ریکٹر نسٹ انجینئر محمد اصغر اس کے لئے لائقِ مبارک باد ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو دوسرے تعلیمی ادارے بھی اپنے طلبہ کو اسلام و پاکستان سے محبت کو جزوِ ایمان بنانے اور برملا اظہار کرنے کے لئے اسی معیار کے مجلّوں کی ترتیب اور اشاعت کو یقینی بنائیں۔